رجسٹرڈ ایل نمبر ۷۳۳۰

جلد ۵۸ ، عدد ۱ اپریل ۱۹۶۲ء

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ ترجمان القرآن

۵- اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور (پاکستان)

سالانہ چندہ ۶ روپے قیمت فی پرچہ ۶۲ پیسے

تفہیمات

از مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

- قرآن مجید کے معرکۃ الآرا مسائل کی دلنشین تفہیم
- انبیاء علیہم السلام کی سیرت پر لگائے ہوئے بیہودہ الزامات کا مدلل جواب
- نبوتِ محمدی کے اثبات اتباع و اطاعت پر سیر حاصل بحث
- تفسیرِ آیات، توضیح احادیث، اور اعتراضات کے جوابات
- مختلف اہم موضوعات پر اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح
- اسلام کے متعلق مختلف غلط فہمیوں کا ازالہ
- مولانا مودودی کی دینی فہم و بصیرت کی آئینہ دار
- سائنٹفک طرزِ استدلال، عالمانہ اور تحقیقی اندازِ بیان

حصہ اول

قیمت مجلد ـــــ اعلیٰ ۵/۵۰ روپے
سستا ایڈیشن

حصہ دوم

قیمت مجلد -/۷ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱۔سی شاہ عالم مارکٹ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۱	اپریل سنہ ۱۹۶۲ء	جلد ۵۸

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر
دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

گذشتہ ترجمان القرآن میں ہم نے بتایا تھا کہ مغرب کی ذہنی غلامی نے ہماری فکری صلاحیتوں کو اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ ہم میں وقت کے تقاضوں کو بھی صحیح طور پر سمجھنے کی قوت باقی نہیں رہی۔ دنیائے مغرب اس وقت جن برائیوں میں ملوث اور جن اخلاقی اور روحانی بیماریوں کا شکار ہے ہم نے انہیں اپنی حماقت سے وقت کے تقاضے سمجھ لیا ہے۔ اور اس بات کے درپے ہیں کہ وہ کسی طرح ہمارے معاشرے کی رگ و پے میں سرایت کر جائیں۔ ہماری خیرہ نگاہیں مغربی تہذیب کے معائب کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔

فکر و نظر کا یہ انقلاب ہماری قوم کے ساتھ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ دنیا کی ہر قوم جب ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی غلامی اختیار کر لیتی ہے تو پھر اس کے اندر سب سے خوفناک بیماری یہ پرورش پاتی ہے کہ اسے اپنے آپ پر، اپنے افکار و نظریات پر، اپنی بنیادوں پر قطعاً اعتماد نہیں رہتا۔ اس کے پاس برے اور بھلے کے درمیان تمیز کرنے کے لئے اپنا کوئی معیار نہیں ہوتا اور وہ زندگی کے سارے معاملات کو دوسروں کی فراہم کردہ عینک سے دیکھتی ہے۔ فلسفہ تاریخ کے مشہور مفکر ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف "مقدمہ" میں اس موضوع پر بڑی فکر انگیز بحث کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> یہ چیز انسانی فطرت میں داخل ہے کہ جو قوم کسی دوسری قوم کو فتح کر لیتی ہے وہ صرف اس کے ملک کو ہی سرنگوں نہیں کرتی بلکہ اس کی نظروں کو بھی مفتوح کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مغلوب قوم کے دل و دماغ میں یہ خیال راسخ ہو جاتا ہے کہ غالب قوم غلبہ

اُس کے بے پناہ کمالات کی وجہ سے ہے۔ اس لئے وہ اپنی حیات کے ہر شعبے میں اُس کی نقل اُتارنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس فعل وعمل کو ہم اقتداء سے تعبیر کرتے ہیں ...... مغلوب قوم لباس، پوشاک، سواری، سامان اور زندگی کے سارے شعبوں میں اس امر کے لئے کوشاں رہتی ہے کہ وہ کسی طرح اپنے آپ کو حاکم قوم کے رنگ میں رنگ لے۔ چنانچہ آج ہمارے زمانہ میں اہلِ اندلس جلالقہ سے لباس، وضع قطع اور دوسری عادات میں گہری مشابہت پیدا کر رہے ہیں اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ مکانوں اور کارخانوں میں زینت و آرائش کے لئے جو تصاویر اور نقش ونگار بنائے جا رہے ہیں اُن میں بھی ان حاکموں کی پوری پوری نقالی کی گئی ہے اور جو شخص بھی ذرا گہری نظر سے ان کا مطالعہ کرے گا تو اُسے فوراً معلوم ہو جائیگا یہ سب بالآخر ان استیلاء وغلبہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔[1]

ابن خلدون نے اقتداء کی اس بحث کے ضمن میں آگے چل کر اس حقیقت کی بھی وضاحت کی ہے کہ محکوم قوم حاکم قوم کی خوبیوں کی پیروی نہیں کرتی بلکہ اُس کی بُرائیوں کو اپنے اندر رواج دینے کے لئے کوشاں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ایک قوم دوسری قوم کی ذہنی غلامی اختیار کرلیتی ہے تو اُس کے اندر سے اس کی تخلیقی اور تعمیری قوتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ اُس کے اندر یہ طاقت نہیں رہتی کہ وہ ایک ترقی پذیر اور باصلاحیت قوم کی خوبیوں کو اپنے اندر پیدا کرسکے، اُس کی نگاہ ہر پھر کر اُس کے اُن پہلوؤں پر پڑتی ہے جن کو اختیار کرنے میں اُسے کچھ محنت نہ کرنی پڑے اس لئے وہ صرف اس کے عیش وعشرت کے انداز کو ہی اپنانے پر اکتفا کرتی اور حاکم قوم کی زندگی کے وہ شعبے جو اُس کی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کے ترجمان ہوتے ہیں اُس کی نظروں سے یکسر اوجھل رہتے ہیں۔ کسی قوم کا دوسری قوم کی ذہنی غلامی پر رضا مند ہو جانا اس بات کی بدیہی شہادت ہے کہ اُس کے اندر بڑھنے، ترقی کرنے اور اپنی قوتوں کو ایک راہ پر لگانے کا جذبہ بالکل مفقود ہو چکا ہے۔ اگر یہ

---

[1] مقدمہ ابنِ خلدون ۔ ص ۱۴۷ ۔

بات نہ ہوتی تو اُسے ذلت و خواری کی زندگی اختیار کرنے کی آخر کیا ضرورت تھی۔ تعمیری صلاحیتوں کے ساتھ کوئی قوم ذہنی غلامی قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتی۔ ان صلاحیتوں کا وجود ایک ناقابلِ تسخیر قوت اور ایک نہ مٹنے والا جذبہ اور زندہ احساس کی علامت ہے۔ جب کسی قوم میں یہ خوبیاں موجود ہوں تو اُس کے اندر اس بات کے لئے فطری اُمنگ پیدا ہوتی ہے کہ وہ دُنیا کی دوسری اقوام پر فوقیت حاصل کرے۔ وہ جن افکار و نظریات پر ایمان رکھتی ہے دوسروں کو بھی انہیں قبول کرنے پر آمادہ کرے۔ اور زندگی کا جو نہج اُس نے اختیار کیا ہے دوسروں کو بھی اُسے اپنانے کی تلقین کرے۔ وہ صرف اپنے طرزِ فکر اور طرزِ عمل ہی کو سربلند دیکھنا چاہتی ہے اور انہیں کے لئے جیتی اور انہیں کے لئے مرتی ہے۔ ظاہر بات ہے جس قوم کے اپنے افکار کے بارے میں یہ احساسات ہوں وہ فکری اور ذہنی اعتبار سے کسی دوسری قوم کی قیادت و رہنمائی قبول نہیں کر سکتی۔ ذلت آمیز موقف تو وہی قومیں اختیار کرتی ہیں جن کے اندر تعمیر کی ساری قوتیں سلب ہو چکی ہوں۔ اس لئے وہ غالب قوم کی صرف بُرائیاں ہی اپناتی ہیں۔ کیونکہ انہیں اپنانے میں کوئی محنت و قوت صرف نہیں ہوتی۔ باقی رہیں حاکم قوم کی خوبیاں تو انہیں اختیار کرنے کی نہ تو محکوم قوم میں قوت ہوتی ہے اور نہ ولولہ اور آرزومندی۔

آپ اگر اُمتِ مُسلمہ کے حالات کا جائزہ لیں تو آپ کو اس دعوے کی صداقت پوری طرح معلوم ہو جائے گی۔ گزشتہ سو سال کے عرصہ میں ہم نے پوری محنت اور جدوجہد کے بعد آخر اہلِ یورپ کی کونسی خوبی اپنائی ہے۔ کیا ہم نے امورِ مملکت کے انتظام و انصرام میں اُن جیسی استعداد کار پیدا کی ہے؟ کیا ہم نے دیانت اور امانت کا وہ معیار قائم کرنے کی کوشش کی ہے، جو اُنہوں نے صنعت و تجارت میں قائم کر رکھا ہے؟ کیا ہم نے اپنے اندر نظم و ضبط کی وہ صلاحیتیں پیدا کی ہیں جو اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طغرۂ امتیاز ہیں؟ کیا علم و تحقیق کے میدان میں ہم اُن جیسی مشقت اُٹھا رہے ہیں۔ کیا اپنے دین کی اشاعت کے معاملے میں ہم میں وہ سوزمندی اور تڑپ موجود ہے جو اُن کے ہاں دکھاتی دیتی ہے؟ کیا ہمارے ہاں بھی عدل و انصاف، راستبازی، شجاعت اور جُرأت کے نمونے اسی تعداد میں ملتے

ہیں جتنے کہ اُن کے ہاں دکھائی دیتے ہیں؟ کیا قوم اور ملک یا مفادِ عامہ کے لئے ہم میں ایثار کا وہی جذبہ کار فرما ہے۔ جو اُن کے ہاں زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتا ہے؟ آپ اس نقطہ نظر سے جب حالات کا جائزہ لیں گے تو آپ کو سخت مایوسی ہو گی۔ انسانیت کی ان اعلیٰ اور ارفع صفات میں سے کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو ہم نے اپنے اندر پیدا کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان صفات کو معاشرے کے اندر ترقی دینے کے کے لئے سخت قسم کی ریاضت درکار ہے، ان کی ترویج و اشاعت جانی اور مالی ایثار، خواہشات اور تمناؤں کی قربانی کی طالب ہے، ان کو فروغ دینے کے لئے نفس کی بہت سی لذتوں سے دست کش ہونا پڑتا ہے اور یہ اس قسم کی آزمائشیں ہیں جن میں سے کوئی فرد یا قوم یونہی ہنسی خوشی کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ان میں کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ قوم کا ہر فرد کسی بلند و بالا مقصد کی محبت میں سرشار ہو اور اس کے حصول کے لئے ہر قسم کا ایثار کرنے کے لئے عزم بالجزم رکھتا ہو۔ ظاہر بات ہے کہ یہ جذبہ کسی ایسی قوم میں کبھی پرورش نہیں پا سکتا جس نے خود اعتمادی جیسی نعمت کو کھو دیا ہو، جسے اپنے آپ، افکار و نظریات پر کسی قسم کا کوئی بھروسہ نہ رہا ہو، جس کی غور و فکر کی قوتیں شل ہو چکی ہوں اور جس نے خود اپنے جذبات و احساسات کو افسردہ بنا دیا ہو۔ اس قسم کی شکست خوردہ قوم میں یہ ہمت ہی پیدا نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنی دنیا الگ تعمیر کرنے کی کوشش کرے۔ تعمیری کام ہمیشہ تعمیری صلاحیتوں اور صحت مند احساسات کا تقاضا کرتا ہے اور یہ صفات کسی ایسی قوم میں پرورش نہیں پا سکتی، جس نے دوسری قوموں کی نقالی کو اپنا شعار بنا لیا ہو۔ محکوم قوم اپنے عافیت پسندانہ مزاج، اپنی غلامانہ ذہنیت اور اپنی ہوس پرستانہ طبیعت کی وجہ سے غالب تہذیب کے صرف انہیں پہلوؤں کی نقالی کرے گی جن میں اُسے کسی قسم کی محنت یا ایثار نہ کرنا پڑے۔ چنانچہ دیکھئے کہ آج ہمارے ہاں اہلِ مغرب کے جن شعار کو ایک دوسرے سے بڑھ کر اپنانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ قریب قریب وہی ہیں جن میں خیر سے زیادہ شر کا پہلو نمایاں ہے۔ ہمارے ہاں سارا زور مرد و زن کے آزادانہ میل جول، ضبطِ تولید، ناچ گانے کی مخلوط مجالس کے اہتمام پر صرف ہو رہا ہے۔ باقی رہے وہ شعبے جن میں عقل و فکر، تدبر و تفکر، ایثار اور قربانی درکار ہے تو اُن میں ہماری طبیعتیں تقلیدِ مغرب پر کبھی آمادہ نہیں ہونے

پہنچتی ہیں، اور وہ مختلف حیلوں بہانوں سے اس سنگلاخ اور دشوار گذار راستہ سے فرار کی کوشش کرتی ہیں۔

ہمارا یہ عافیت پسندانہ طرزِ عمل یوں تو زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے لیکن اس وقت ہم صرف اس کے ایک پہلو کا ذکر کریں گے۔

جن حضرات نے اقتدار کی تاریخ کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اقتدار اپنے مزاج کے اعتبار سے بڑا احساس اور جذباتی ہوتا ہے۔ وہ کبھی اس بات کو گوارا نہیں کرسکتا کہ اس پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد کی جائے یا اُس کے فیصلوں کے خلاف کسی طرف سے کوئی اُنگلی اُٹھے۔ اس بنا پر اُسے جب کبھی بھی موقع ملا تو اُس نے سب سے پہلے اس امر کی کوشش کی کہ وہ اپنے دائرہ اختیار کو زیادہ سے زیادہ وسیع کرے تاکہ کوئی اُس کے راستے میں مزاحم نہ ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس نے اس بات کا بھی پورا پورا التزام کیا کہ وہ اس اقتدار کو اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ محفوظ کرے اور عوام مسندِ اقتدار کو اُس کی جائز میراث سمجھتے ہوئے اُس کی طرف کبھی ہاتھ بڑھانے کی جُرأت نہ کریں۔ اس کے علاوہ ہمیشہ اس بات کے لئے بھی کوشاں رہا کہ وہ اُن آوازوں کو سختی کے ساتھ دبا دے جن میں اُس کی مدح و ستائش کے علاوہ حقیقت کی تلخی کا بھی کوئی جُزو شامل ہو۔ کیونکہ اُس کے کان کسی ناگوار بات کو سُننے کے متحمل ہی نہیں ہوتے۔

ایک طرف اصحابِ اقتدار کا اقتدار کے معاملہ میں یہ طرزِ عمل رہا ہے تو دوسری طرف جن لوگوں نے کسی معاشرے میں حیوان بن کر نہیں بلکہ انسان کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا عزم کیا۔ انہوں نے انسانی حقوق کی جان پر کھیل کر بھی حفاظت و پاسبانی کی۔ انہوں نے بڑے بڑے جباروں اور قہاروں کو اُن کی غلط روی پر برملا ٹوکا اور اُن کے انسانیت سوز عزائم کا پوری قوت سے راستہ روکنے کی سعی کی۔ اس راہ میں نہ تو ظالموں کا ظلم و استبداد اُن کے ارادوں کو شکست دے سکا اور نہ ہی عیار اور

چاہارب اقتدار کی چابازیاں انہیں خاموش کرنے میں کامیاب ہوئیں۔ انہیں نے ہر قسم کے مصائب برداشت کئے لیکن وہ اپنے انسانی حقوق سے دستبردار ہونے پر کبھی آمادہ نہ ہوئے۔ اربابِ اقتدار اور حقوقِ انسانیت کے پاسبانوں کے درمیان یہ کش مکش اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ مدنی الطبع انسان کی سرگزشت۔

تاریخِ انسانی میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اور اُن کے پاکباز خلفاء کا دور ایک ایسا سعید دور ہے جس میں اقتدار کے مسئلہ کو بالکل عدل و انصاف کے ساتھ حل کر دیا گیا۔ حضور نے سب سے پہلے تو اس باطل خیال کی تردید کی کہ دنیا میں کوئی شخص یا ادارہ غیر مسئول اقتدار کا دعویدار ہو سکتا ہے۔ اسلام میں چونکہ حاکمیت خالقِ کائنات کی ہے اس لئے کوئی فرد یا گروہ بھی من مانی کارروائیاں کرنے کا مجاز نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے جو حقوق انسانوں کو دے رکھے ہیں، انہیں کوئی فرد بھی اپنے ذاتی منشا اور مرضی سے سلب نہیں کر سکتا۔ ان سے صرف احکامِ الٰہی کے مطابق ہی کسی کو محروم کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا خدا اور اُس کے رسول کے فیصلوں کی غیر مشروط اطاعت کا حلف اقتدار پر وہ سب سے بڑی پابندی ہے جو اسلام نے عائد کی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے پہلے خلیفہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کا بارِ گراں اُٹھانے کے بعد جو سب سے پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اُس میں اس حلف کی پوری تصریح موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا:

ایها الناس فانی قد ولیت علیکم ولست بخیرکم فان أحسنت فاعینونی وان اساءت فقومونی الصدقُ امانةٌ والکذب خیانةٌ والضعیف منکم قوی عندی حتی أزیح علته انشاء اللہ والقوی فیکم ضعیف حتی آخذ

اے لوگو! مجھے تمہاری امارت سونپی گئی ہے حالانکہ میں تم سے بہتر اور افضل نہیں ہوں۔ پس اگر میں صحیح کام کروں تو تم میری دستگیری کرو اور اگر کوئی غلط اقدام کروں تو مجھے راہِ راست پر لاؤ۔ سچائی ایک امانت ہے اور کذب خیانت ہے۔ تم میں سے جو کمزور ہے وہ میرے نزدیک قوی ہے جب تک کہ میں اس کی شکایت کا

منه الحق ان شاء الله لا يدع قوم الجهاد فی سبیل الله الا ضربهم الله بالذل ولا يشيع قوم قط الفاحشة الا عمهم الله بالبلاء اطیعونی ما اطعت الله ورسوله فلا طاعة لی علیکم ۔ قوموا الیٰ صلوتکم رحمکم الله

(البداية والنهاية جلد ۶ ص ۲۴۸)

ازالہ نہ کردوں۔ اور تم میں سے جو قوی ہے وہ میرے نزدیک کمزور ہے جب تک کہ میں اُس سے حق نہ لے لوں۔ جو قوم جہاد سے دست کش ہو جاتی ہے اللہ تعالیٰ اُن پر ذلت طاری کر دیتا ہے اور جس قوم میں فاحش باتیں عام ہو جاتی ہیں اللہ تعالیٰ اُسے مصائب میں گرفتار کر دیتا ہے۔ جب تک کہ میں اللہ اور اس کے رسول کا اطاعت گذار رہوں تم میری اطاعت کرو اور جب میں اللہ اور اُس کے رسول سے روگردانی کروں تو تم میری اطاعت سے آزاد ہو۔ اچھا اب نماز کے لئے تیار ہو جاؤ۔ اللہ تم پر رحم فرمائے۔

اس بلیغانہ خطبہ میں حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اُن ساری پابندیوں کا ذکر فرما دیا ہے جو اسلام نے اقتدار پر عائد کی ہیں۔ تاکہ وہ غلط راہ پر پڑ کر لوگوں کے لئے مصیبت اور پریشانی کا باعث نہ بنے۔ اس میں سب سے پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام میں اقتدار کبھی غیر مسئول نہیں ہوتا۔ برسراقتدار لوگوں کی اطاعت اُسی وقت تک فرض ہوتی ہے جب تک کہ وہ خدا اور اس کے رسول کے مطیع اور فرمانبردار رہیں اور اگر وہ اللہ اور اُس کے رسول کی غلامی کا قلادہ اپنی گردنوں سے اُتار دیں۔ تو پھر وہ رعایا سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے مجاز نہیں ہوتے۔ دوسرے اس امر کا فیصلہ کرنے کے لئے کہ کیا حکمران خدا اور اُس کے رسول کے احکام کی دل و جان سے پابندی کر رہے ہیں۔ اسلام نے عوام کو اس بات کا پورا اختیار دیا ہے کہ وہ برسراقتدار گروہ کی نہ صرف پبلک لائف بلکہ پرائیویٹ لائف پر بھی مواخذہ اور احتساب کریں اور کوئی شخص بھی انہیں اپنے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا چنانچہ مسلمان حکمران سلطنت کے اہم امور سے لے کر اپنی زندگی کے معمولی سے معمولی معاملات تک خدا اور خلق دونوں کے سامنے جوابدہ ہیں اور خلافتِ راشدہ کے عہد میں تو اس امر کا پورا التزام کیا جاتا تھا کہ رعایا کے اندر احتساب

کا جذبہ افسردہ نہ ہونے پائے۔ ایک موقع پر ایک شخص نے کئی بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرکے کہا کہ اتق اللہ یا عمر یعنی "اے عمر خدا سے ڈر" حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کو اس سے باز رکھنا چاہا اور کہا کہ بس بہت ہوا۔ حضرت عمر نے فرمایا، نہیں انہیں کہنے دو۔ اگر یہ لوگ نہ کہیں تو بے مصرف ہیں اور اگر ہم لوگ نہ مانیں تو ہم بیکار ہیں۔ ایک مرتبہ خلیفہ ثانی نے رعایا کے حقوق و فرائض کی تشریح کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

"اور تم میرے نفس کے مقابلے میں میری مدد اسی طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارے میں میری خیر خواہی (نصیحت) کرتے رہو۔

خلفائے راشدین احتساب کے اس جذبہ کو زندہ رکھنے کے کتنے آرزومند تھے اس کا اندازہ وہی لوگ پوری طرح کر سکتے ہیں جنہوں نے اس بابرکت دور کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔ ایک مرتبہ لوگوں میں یہ غلط فہمی پھیل گئی کہ آدمی پر صرف اپنے اعمال کی ذمہ داری ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہوتا ہے اس کے متعلق اس سے کوئی باز پرس اور مواخذہ نہ ہوگا۔ یہ لوگ قرآن مجید کی اس آیت سے استدلال کرتے تھے کہ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ لَا یَضُرُّکُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اھْتَدَیْتُمْ۔ (اے ایمان والو! تم اپنے آپ کو بچاؤ، جو لوگ گمراہ ہیں ان کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی جب کہ تم خود ہدایت پر رہو) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جب اس صورتِ حال کا علم ہوا تو انہیں سخت فکر لاحق ہوئی اور خیال کیا کہ اگر یہ احساس افسردہ پڑ گیا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی وہ روح ہی لوگوں کے اندر مُردہ ہو جائے گی جس کے بغیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی نظام کا اپنی صحیح اور صحت مند حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے لوگوں کے سامنے تقریر فرمائی۔

اے لوگو تم اس آیت کا حوالہ دیتے ہو یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلَیْکُمْ اَنْفُسَکُمْ۔ اور ہم نے

قاضی ابو یوسف کتاب الخراج ص ۷۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے کہ آپ فرماتے تھے:

لوگ جب بُرائی دیکھتے ہیں اور اس کی اصلاح نہیں کرتے تو ممکن ہے کہ اُس کے سبب سے جو عذاب آئے وہ سب کو اپنی لپیٹ میں لے لے۔

مختصر الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ اسلام نے بعض نہایت ہی حکیمانہ تدابیر کے ذریعہ مثلاً اقتدار کو احکام الٰہی اور سنتِ نبوی کا پابند بنا کر، اور عوام کی اطاعت کو اس پابندی سے وابستہ رکھ کر، لوگوں کو اظہارِ رائے کی آزادی دے کر اور اُن کے اندر احتساب کے جذبہ کی صحیح طور پر نشوونما کر کے، عدلیہ کو انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد رکھ کر، اقتدار کو ظلم کا آلہ کار بننے کی بجائے اُسے نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا ایک مؤثر ذریعہ بنایا ہے۔

اسلام کی بعض دوسری اقدار کی طرح اقتدار کے معاملے میں بھی بہت سی غیر مسلم اقوام نے اسلامی تعلیمات کو کسی حد تک اپنانے کی کوشش کی ہے۔ صدیوں کے تلخ تجربات نے ان کے اندر بڑی شدت کے ساتھ یہ احساس پیدا کیا کہ بپھرا ہوا اقتدار کسی قوم اور ملک کے لئے مفید اور کار آمد ثابت نہیں ہو سکتا اگر وقتی ہیجان اور جوش میں اس سے کوئی فائدہ بھی حاصل ہو جائے تو اس کے نتائج دیرپا نہیں ہوتے اور یہ اقتدار جلد ہی بے لگام ہو کر اُن راہوں پر چل نکلتا ہے جو کسی قوم کو تباہی اور بربادی کی طرف لے جاتی ہیں۔ اُنہوں نے اس سلسلہ میں پہلا سبق یہ سیکھا ہے کہ اگر لوگوں کو اپنے خیالات اور احساسات کے اظہار کی آزادی حاصل نہ ہو گی تو پھر ملک کے اندر خفیہ تحریکیں زیر زمین نہایت ہی خوفناک سازشوں کا جال بچھا دیں گی۔ کسی قوم کے لئے اس سے زیادہ اندوہناک صورتِ حال اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ وہ اقتدار جسے محض قوت و طاقت کے بل بوتے پر عوام پر مسلط کیا جائے اور لوگوں کے دل و دماغ اُسے قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوں وہ قوم کے اندر قنوطیت اور احساسِ شکست پیدا کرتا ہے جو اُس کے لئے موت کا پیغام ہے۔ قانون کے ذریعہ لوگوں کی زبانوں پر پہرے بٹھائے جا سکتے ہیں لیکن آج تک نوعِ بشری کوئی ایسا مؤثر اور ہمہ گیر قانون نہیں بنا سکی

جو خیالات و احساسات کے ایوانوں کو مقفل کرنے میں کامیاب ثابت ہوا ہو۔ جبر و استبداد کا نتیجہ لازمی طور پر یہی ہوتا ہے کہ لوگوں کے اندر نفرت کے جذبات بڑی سُرعت کے ساتھ نشوونما پاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد جب یہ لاوا پھٹتا ہے تو اس سے قومی زندگی کے سارے شعبے زیروزبر ہونے شروع ہوتے ہیں اور ایک ایسا خوفناک زلزلہ آتا ہے کہ وہ قوم صدیوں تک سنبھلنے نہیں پاتی۔

آپ دُنیا کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے تو آپ کو اس بات کی صحت خود بخود معلوم ہو جائے گی۔ انگلستان جسے آج جمہوریت کا گہوارہ کہا جاتا ہے چار صدیاں پیشتر تک سازشوں اور بغاوتوں " مرکز تھا۔ یہاں آئے دن طوفان اُٹھتے رہتے تھے اور وہاں کے باشندوں کی زندگی میں ہر وقت تلاطم پیدا ہوتا رہتا تھا۔ لیکن اس ملک نے جس روز سے اس حقیقت کو پہچان لیا ہے کہ جبر و استبداد سے رائے عامہ کو ہموار نہیں کیا جا سکتا اُسی دن سے اُن کی زندگی میں ایک سکون اور قرار پیدا ہو گیا ہے۔ وہاں جس وقت ضرورت محسوس ہوتی ہے حالات کے تقاضوں کے تحت اقتدار میں مناسب تغیّر و تبدل کر لیا جاتا ہے۔ لیکن اُن کے اندر کوئی بغاوت اور شورش نہیں اُٹھنے پاتی۔ اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہاں کے حکمران طبقے تیر و تفنگ سے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کی بجائے اُن کے دلوں کو مفتوح کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ عوام جو بات اُن سے کہتے ہیں وہ اُس پر مشتعل ہونے اور اُنہیں دردناک عذاب کی وعید سنانے کی بجائے اُسے بڑے تحمل اور سکون کے ساتھ سنتے ہیں اور پھر اُسے جذبات کے شعلوں میں جلانے کی بجائے اُسے فہم و فراست کی معتدل میزان میں تول کر دیکھتے ہیں کہ اس میں ملک اور قوم کا کیا فائدہ اور کیا نقصان ہے اور پھر اپنی بات جوتے کے زور سے منوانے کی بجائے اُسے دلائل کے زور سے منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔

انگلستان کے مقابلے میں جب ہم دُنیائے اسلام کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے یہ کسی آتش فشاں پہاڑ کے دہانے پر تعمیر کی گئی ہے آج اس ملک سے انقلاب کی خبر آ رہی

ہے تو کل دوسرے ملک سے بغاوت کے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ کہیں عوام کے مختلف طبقات ایک دوسرے سے برسرِپیکار ہیں اور کہیں رعایا اور شہنشاہ ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ صبح ایک گروہ مسندِ اقتدار پر متمکن ہے تو شام کو دوسرا گروہ اُس پر قابض نظر آتا ہے۔ اس سرپھٹول میں مسلمانوں کی جتنی قیمتی جانیں ضائع ہوئی ہیں، اُن کے وقت اور مال کا جس قدر زیاں ہُوا ہے اُس کے تصور ہی سے جسم کانپ اُٹھتا ہے۔ اس بربادی کی وجہ بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہمارے ہاں جو فرد یا گروہ بھی برسرِاقتدار آتا ہے وہ رائے عامہ کا اعتماد حاصل کرنے کی بجائے ایسی تدبیریں سوچنے میں منہمک ہو جاتا ہے جس سے اُس کے اقتدار کی عمر زیادہ سے زیادہ لمبی ہو سکے۔ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے جوڑ توڑ کرتا ہے، ملک کے مضبوط اور طاقتور لوگوں کو سیاسی رشوتیں دیتا ہے، اُنہیں عہدے کے لالچ سے خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جما کر لوگوں کو مرعوب کرنے کی مختلف راہیں نکالتا ہے۔ آج ترکی، ایران، مصر، عراق، افغانستان میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں کیا وہ اس افسوسناک صورتِ حال کی شہادت فراہم نہیں کرتے؟ کیا اس کی وجہ یہ ہے پوری دُنیائے اسلام صرف شورش پسندوں سے ہی بھر گئی ہے۔ جو یونان کے روایتی دیوتاؤں کی طرح تباہی و بربادی ہی میں لذّت و راحت محسوس کرتے ہیں، اور سکون و طمانیت سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اقتدار کو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کا مظہر نہیں سمجھتے اس لئے وہ اُس سے نجات حاصل کرنے کے لئے برابر جدوجہد کرتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ اُمتِ مسلمہ پر اگرچہ انحطاط طاری ہے۔ لیکن اُس کے دماغ میں ابھی اتنا فتور پیدا نہیں ہُوا کہ وہ اپنے آپ کو نیست و نابود کرنے پر ہی مصر ہو۔

اس غیر مسئول اقتدار سے صرف دُنیائے اسلام کو ہی پے در پے نقصان نہیں پہنچ رہا بلکہ دورِ جدید میں اس سے بعض بڑی عظیم الشان قومیں تباہ ہوئی ہیں۔ جرمنی جیسی بہادر اور جری قوم کی بربادی کا سبب یہی غیر مسئول اقتدار ہی تو تھا۔ ہٹلر کو اپنی آمرانہ حیثیت قائم رکھنے کے لئے اہلِ جرمن کے جذبات کو اس حد تک مشتعل کرنا پڑا کہ ملک کی پوری فضا شعلہ جوالہ بن کر رہ گئی۔ قوم نے اپنے داخلی اُمور

خارجی مسائل پر عقل و فکر سے غور کرنے کی بجائے جذبات کی شعلہ فشانیوں سے حل کرنے کی کوشش کی۔ جذبات کے اس طرح بے لگام ہونے سے ایک وقتی جوش تو ضرور پیدا ہو گیا لیکن اس سے جو نتائج برآمد ہوئے وہ آج پوری نوعِ انسانی کے سامنے ہیں۔ یہ مہتم بالشان قوم جس نے چند دنوں کے اندر پوری دنیا میں تہلکہ مچا دیا تھا، راکھ کا ڈھیر بن کر رہ گئی ہے۔ یہ معاملہ کسی ایک قوم یا عہد کے ساتھ مخصوص نہیں دُنیا کے جس ملک کے اندر بھی اقتدار غیر مسئول ہو گا وہ مقدس تمناؤں کے باوجود بے راہ رو ہوتا چلا جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔

یورپ کی کئی قومیں ایسی ہیں جنہوں نے غیر مسئول اقتدار کی ریشہ دوانیوں کو دیکھ کر اسے آئین و ضوابط کا پابند کرنے کی بڑی کامیاب کوششیں کیں۔ مثال کے طور پر برطانیہ میں اس مسئلہ کو جس خوبی کے ساتھ حل کیا گیا ہے اُس کی نظیر دُنیا پرست قوموں میں بہت کم ملتی ہے۔ انگلستان میں اقتدار گو تعلیمات الٰہی کا پابند نہیں لیکن وہ اتنا بے لگام بھی نہیں کہ قوم کی خواہشات کو جس طرح چاہے روندتا رہے۔ اُس پر بعض بڑی کڑی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ وہ ملک کے دستور کا پابند ہے۔ پھر اس قوم کی بعض ایسی روایات ہیں جن کا اُسے ہر حال میں احترام کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ہر قول اور فعل کے لئے اپنے آپ کو قوم کے سامنے جواب دہ سمجھتا ہے۔ ایک مضبوط عدلیہ جو اُس کے دباؤ سے یکسر آزاد ہے اُس سے اس کی کارگذاریوں کے بارے میں فیصلہ طلب کیا جا سکتا ہے اور اُس فیصلے کا اس پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اور سب سے بڑھ کر اس قوم کا اقتدار ہر لمحہ رائے عامہ کی تائید کا محتاج ہے۔ وہ اس سے بے نیاز ہو کر ایک قدم بھی اُٹھانے کی جُرأت نہیں رکھتا۔ ان پابندیوں کا نتیجہ یہ ہے کہ اس قوم کے فکری جہاز بے لنگر نہیں ہوتے۔ وہ سخت طوفانوں میں گھِر کر بھی اپنے آپ کو کسی نہ کسی طرح بچانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اس قوم کو گذشتہ چند سالوں سے جن مصائب و شدائد کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے وہ اگر کسی ایسی قوم کو درپیش ہوتے جہاں اقتدار کو عوام کی دلی تائید حاصل نہ ہوتی، تو وہ قوم بیرونی دشمنوں کے حملوں سے کہیں پہلے اندرونی

خلفشار میں مبتلا ہو کر برباد ہو چکی ہوتی۔

اقتدار پر جائز اور مناسب قسم کی پابندیاں لگا کر اُس کی قوت وطاقت کو قوم کی فلاح وبہبود کے لئے استعمال کرنا وقت کا ایک نہایت ہی اہم تقاضا ہے۔ جس سے اُمتِ مسلمہ ایک لمحہ کیلئے بھی صرفِ نظر نہیں کر سکتی۔ مگر ہم یہ بات سمجھنے سے قاصر ہیں کہ ملّتِ بیضا کے سربراہ جنہیں آرٹ اور کلچر کی معمولی سے معمولی جزئیات کے معاملے میں وقت کے تقاضوں کا شدّت کے ساتھ احساس ہوتا ہے وہ اس بڑے تقاضے کو آخر کیوں سمجھ نہیں پاتے۔ اور انہیں اگر اس کی طرف توجہ بھی دلائی جاتی ہے تو وہ یہ کہہ کر اسے نظرانداز کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ محض تعیش ہے جس کی ہماری قوم متحمل نہیں ہو سکتی۔ رموزِ مملکت خسرواں دانند۔ لیکن ہم جیسے عام شہریوں کے دل میں یہ سوال ضرور اُبھرتا ہے کہ کیا ہمارے ملکی خزانے اُن ساری عیاشیوں کے پوری طرح متحمل ہیں جنہیں یہاں پھیلانے کے لئے سر توڑ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ کیا یہ عیش پرستیاں ہی ہمارے لئے وقت کے تقاضے ہیں اور وہ سارے کام جن سے ہماری اجتماعی زندگی کی تعمیر ہو سکتی ہے وہ ہمارے لئے شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

فکر ونظر کا یہ تضاد آپ کو پوری دُنیائے اسلام میں ملے گا۔ ٹرکی جس نے مغرب کی تقلید میں اپنی اجتماعی زندگی سے اسلام کو خارج کیا، جس نے عفت مآب بیٹیوں کو گھروں سے نکال کر فوج اور کارخانوں میں بھرتی کیا، اُن کے چہروں سے قوت وطاقت کے ساتھ نقاب نوچے۔ اور انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنے اندر مغربی عورتوں کی سی آزادی اور روشن خیالی پیدا کریں، جس نے ترکوں کو لباس، وضع قطع تبدیل کرنے کی سختی کے ساتھ تلقین کی، جس نے اُن کے نام بدلے، اُن کے صدیوں کے پرانے رسم الخط کو بدل کر اس بات کا التزام کیا کہ اُن کا اپنے ماضی سے رشتہ بالکل منقطع ہو جائے اور وہ ہر لحاظ سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ جائیں۔ وہاں بھی جب نظامِ مملکت کی تشکیل کا سوال آیا

تو اس معاملے میں مغرب کی جمہوری اقدار کو بالکل بالائے رکھ کر ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی گئی، جس نے آج تک ترکوں کی قوت کو ایک مرکز پر جمع نہیں ہونے دیا۔ اتاترک اور اُس کے جانثار فدائی عصمت انونو اہلِ مغرب کی ہر ادا پر جان نثار کرتے ہیں، اُن کی تہذیب کو انسانیت کی معراج تصوّر کرتے ہیں، اور اُسے اپنے ملک کے ہاں رائج کرنے اور ترقی دینے کے انتہائی آرزومند ہیں اُ ،کے سامنے جب اقتدار کا مسئلہ آتا ہے تو وہ اپنے پیشوا کی ساری تعلیمات کو پسِ پشت ڈال کر اُسے ایسے انداز سے طے کرتے ہیں جو انتہائی شرمناک ہے۔ یہی صورتِ حال مصر، انڈونیشیا، شام، عراق اور دوسرے اسلامی ممالک میں نظر آتی ہے۔ اس موقع پر ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ اس امت کے اندر اُن برائیوں کو تو پھیلانے کی پوری کوشش کی جاتی ہے جو اُس کے مزاج سے ذرّہ برابر مناسبت نہیں رکھتیں اور ان کے برعکس اسے جمہوریت کی اُن اقدار سے محروم کیا جاتا ہے جن سے اُس کی فطرت کا خمیر اُٹھایا گیا ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کا ذکر ہم نے آغاز میں کیا ہے۔ جب ایک قوم کسی طاقتور قوم کی ذہنی غلامی میں گرفتار ہو کر اُس کی نقالی کرتی ہے تو وہ صرف اُس کے کمزور پہلوؤں کو ہی اپناتی ہے اور اُس کی خوبیاں اپنے اندر پیدا کرنے کی ہمت و طاقت نہیں رکھتی۔

برسرِاقتدار گروہ کے لئے یہ کام تو بالکل آسان ہے کہ وہ اس روبہ انحطاط قوم کو جسے غلامی نے عیش و آرام کا خوگر بنا دیا ہے مختلف تدابیر سے مزید عیش پرست بنا دے لیکن اُس کی سہل پسند طبیعت اپنے آپ کو اس بات کے لئے آمادہ نہیں پاتی کہ وہ رائے عامہ کی تربیت کا انتظام کرے۔ وہ اس راہ کی مشکلات کو بخوبی جانتا ہے اور اس کے لئے جس قسم کا ایثار اور محنت درکار ہے وہ اُس سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ کسی ملک یا قوم میں جمہوری روایات صرف اُسی وقت صحیح طور پر نشوونما پاتی ہیں جب سب سے پہلے برسرِاقتدار گروہ اُن کی پوری پوری پابندی کرے۔ وہ اپنے آپ کو ایسے دستور کا پابند بنائے جو اس ملک کے عوام کی خواہشات کا ترجمان ہو، پھر اس

دستور کے مطابق قوم کی تعمیر و ترقی کے لئے جدوجہد کرے اور ہر گام پر پوری قوم کو اپنے اعتماد میں لینے کے لئے کوشاں رہے۔ وہ اپنے آپ کو عوام کے سامنے جواب دہ سمجھے اور انسانوں میں انسان بن کر چلنے کے ڈھنگ سیکھے، اُن پر اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ نہ جماتا رہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جن میں غیر معمولی حوصلہ اور ہمت و طاقت اور تدبّر ہو۔ افسوس ہے کہ مُسلم قوم کے اندر دورِ جدید میں اس معیار کا کوئی گروہ اقتدار کے تخت پر متمکن نہیں ہُوا۔

ہماری ملّت کے اندر گذشتہ چند سالوں میں جن لوگوں کو قیادت اور سربراہی کا منصب حاصل ہُوا ہے انہیں ملّتِ اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا اتنا شدید احساس نہیں جتنا کہ اپنے اقتدار کے حفظ و بقا کی فکر دامنگیر ہے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے بعض ایسی مضحکہ خیز تدابیر اختیار کی جاتی ہیں کہ جن پر پوری دُنیا خندہ زن ہے۔ چند سال پیشتر مصر کے اندر الاخوان المسلمون کا جو حشر کیا گیا، اور حال ہی میں ٹرکی میں جو خونی ڈرامہ کھیلا گیا ہے اُس کی صاحبِ احساس اور فرض شناس قیادت سے توقع نہیں کی جا سکتی۔ آئین کے نام پر یہ بے آئینی اور آزادی اور جمہوریت کے نام پر یہ ظلم واستبداد وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کے دل میں نہ تو خدا کا خوف ہو اور نہ خلق کی شرم اور جنھیں اپنی بڑائی اور کبریائی دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر ہو۔

ضروری اعلان

ماہنامہ "ترجمان القرآن" منصبِ رسالت نمبر کے پرچے دفتر میں موجود ہیں۔ جو حضرات منگوانا چاہیں وہ قیمت بذریعہ منی آرڈر بھیج کر یا وی۔ پی سے منگوا سکتے ہیں۔ قیمت فی پرچہ تین روپے پچاس پیسے ہے۔ محصول ڈاک اس کے علاوہ ہوگا۔ ایجنٹ حضرات کو حسب سابق کمیشن دیا جائے گا۔

منیجر "ترجمان القرآن" لاہور

تفہیم القرآن

الاحزاب

(۷)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، نبی کے گھروں میں بلا اجازت نہ چلے آیا کرو۔[۹۴] نہ کھانے کا وقت تاکتے رہو۔ ہاں اگر تمہیں کھانے پر بلایا جائے تو ضرور آؤ۔[۹۵] مگر جب کھانا کھالو تو منتشر ہو جاؤ، باتیں کرنے

---

۹۴ یہ اُس حکم عام کی تمہید ہے جو تقریباً ایک سال کے بعد سورۂ نور کی آیت ۲۷ میں دیا گیا۔ قدیم زمانے میں اہلِ عرب بے تکلف ایک دوسرے کے گھروں میں چلے جاتے تھے۔ کسی شخص کو کسی دوسرے شخص سے ملنا ہوتا تو وہ دروازے پر کھڑے ہو کر پکارنے اور اجازت لے کر اندر جانے کا پابند نہ تھا۔ بلکہ اندر جا کر عورتوں اور بچوں سے پوچھ لیتا تھا کہ صاحب خانہ گھر میں ہے یا نہیں۔ یہ جاہلانہ طریقہ بہت سی خرابیوں کا موجب تھا۔ اور بسا اوقات اس سے بہت گھناؤنے اخلاقی مفاسد کا بھی آغاز ہو جاتا تھا۔ اس لیے پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھروں میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ کوئی شخص، خواہ وہ قریبی دوست یا دور پرے کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو، آپ کے گھروں میں اجازت لیے بغیر داخل نہ ہو۔ پھر سورۂ نور میں اس قاعدے کو تمام مسلمانوں کے گھروں میں رائج کرنے کا عام حکم دیدیا گیا۔

۹۵ یہ اس سلسلے کا دوسرا حکم ہے۔ جو غیر مہذب عادات اہلِ عرب میں پھیلی ہوئی تھیں اُن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ کسی دوست یا ملاقاتی کے گھر کھانے کا وقت تاک کر پہنچ جاتے۔ یا اس کے گھر آکر بیٹھے رہتے یہاں تک کہ کھانے کا وقت ہو جائے۔ اس حرکت کی وجہ سے صاحب خانہ اکثر عجیب مشکل میں پڑ جاتا تھا۔ منہ پھوڑ کر کہے کہ میرے کھانے کا وقت ہے، آپ تشریف لے جائیے، تو بے مروتی ہے۔ کھلائے تو آخر اچانک آئے ہوئے کتنے آدمیوں کو کھلائے۔ ہر وقت ہر آدمی کے بس میں یہ نہیں ہوتا کہ جب جتنے آدمی بھی اس کے ہاں

میں نہ لگے رہو۔[96] تمہاری یہ حرکتیں نبی کو تکلیف دیتی ہیں، مگر وہ شرم کی وجہ سے کچھ نہیں کہتے۔ اور اللہ حق بات کہنے میں نہیں شرماتا۔ نبی کی بیویوں سے اگر تمہیں کچھ مانگنا ہو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو، یہ تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کیلیے زیادہ مناسب طریقہ ہے۔[97] تمہارے لیے یہ ہرگز جائز نہیں کہ

آجائیں، ان کے کھانے کا انتظام فوراً کرے۔ اللہ تعالٰے نے اس بیہودہ عادت سے منع فرمایا اور حکم دے دیا کہ کسی شخص کے گھر کھانے کے لیے اس وقت جانا چاہیے جبکہ گھر والا کھانے کی دعوت دے۔ یہ حکم صرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے لیے خاص نہ تھا بلکہ اس نمونے کے گھر میں یہ قواعد اسی لیے جاری کیے گئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے ہاں عام تہذیب کے ضابطے بن جائیں۔

[96] یہ ایک اور بیہودہ عادت کی اصلاح ہے۔ بعض لوگ کھانے کی دعوت میں بُلائے جاتے ہیں تو کھانے سے فارغ ہو جانے کے بعد دھرنا مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور آپس میں گفتگو کا ایسا سلسلہ چھیڑ دیتے ہیں جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتا۔ انہیں اس بات کی پرواہ نہیں ہوتی کہ صاحب خانہ اور گھر کے لوگوں کو اس سے کیا زحمت ہوتی ہے۔ ناشائستہ لوگ اپنی اس عادت سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تنگ کرتے رہتے تھے اور آپ اپنے اخلاق کریمانہ کی وجہ سے اس کو برداشت کرتے تھے۔ آخر کار حضرت زینب کے ولیمے کے روز یہ حرکت اذیت رسانی کی حد سے گزر گئی۔ حضور کے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ رات کے وقت ولیمے کی دعوت تھی۔ عام لوگ تو کھانے سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے، مگر دو تین حضرات بیٹھ کر آپس میں باتیں کرنے لگ گئے۔ تنگ آ کر حضور اٹھے اور ازواج مطہرات کے ہاں ایک چکر لگایا۔ واپس تشریف لائے تو دیکھا کہ وہ حضرات بیٹھے ہوئے ہیں۔ آپ پھر پلٹ گئے اور حضرت عائشہ کے حجرے میں جا بیٹھے۔ اچھی خاصی رات گزر جانے پہ جب آپ کو معلوم ہوا کہ وہ چلے گئے ہیں تب آپ حضرت زینب کے مکان میں تشریف لائے۔ اس کے بعد ناگزیر ہو گیا کہ اللہ تعالٰے خود ان بُری عادات پر لوگوں کو متنبہ فرمائے۔ حضرت انس کی روایت کے مطابق یہ آیات اسی موقع پہ نازل ہوئی تھیں۔ (مسلم۔ نسائی۔ ابن جریر)

[97] یہی آیت ہے جس کو آیت حجاب کہا جاتا ہے۔ بخاری میں حضرت انس بن مالک کی روایت ہے کہ حضرت عمر اس آیت کے نزول سے پہلے متعدد مرتبہ حضور سے عرض کر چکے تھے کہ یا رسول اللہ، آپ کے ہاں

اللہ کے رسول کو تکلیف دو[۹۸]، اور نہ یہ جائز ہے کہ ان کے بعد ان کی بیویوں سے نکاح کرو،[۹۹] یہ اللہ

بھلے اور بُرے سب ہی قسم کے لوگ آتے ہیں۔ کاش آپ اپنی ازواج مطہرات کو پردہ کرنے کا حکم دے دیجیے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ازواج رسولؐ سے کہا کہ "اگر آپ کے حق میں میری بات مانی جائے تو کبھی میری نگاہیں آپ کو نہ دیکھیں"۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قانون سازی میں خود مختار نہ تھے، اس لیے آپ اشارۂ الٰہی کے منتظر رہے۔ آخرکار یہ حکم آگیا کہ محرم مردوں کے سوا (جیسا کہ آگے آیت ۵۵ میں آرہا ہے) کوئی مرد حضور کے گھر میں نہ آئے، اور جس کو بھی خواتین سے کوئی کام ہو وہ پردے کے پیچھے سے بات کرے۔ اِس حکم کے بعد ازواجِ مطہرات کے گھروں میں دروازوں پر پردے لٹکا دیے گئے، اور چونکہ حضور کا گھر تمام مسلمانوں کے لیے نمونے کا گھر تھا، اس لیے تمام مسلمانوں کے گھروں پر بھی پردے لٹک گئے۔ آیت کا آخری فقرہ خود اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ جو لوگ بھی مردوں اور عورتوں کے دل پاک رکھنا چاہیں انھیں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

اب جس شخص کو بھی خدا نے بینائی عطا کی ہے وہ خود دیکھ سکتا ہے کہ جو کتاب مردوں کو عورتوں سے رو در رو بات کرنے سے روکتی ہے، اور پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مصلحت یہ بتاتی ہے کہ "تمہارے اور ان کے دلوں کی پاکیزگی کے لیے یہ طریقہ زیادہ مناسب ہے"، اُس میں سے آخر یہ نرالی روح کیسے کشید کی جا سکتی ہے کہ مخلوط مجالس اور مخلوط تعلیم اور جمہوری ادارات اور دفاتر میں مردوں اور عورتوں کا بے تکلف میل جول بالکل جائز ہے اور اس سے دلوں کی پاکیزگی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی کو قرآن کی پیروی نہ کرنی ہو تو اس کے لیے زیادہ معقول طریقہ یہ ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی کرے اور صاف صاف کہے کہ میں اس کی پیروی نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن یہ تو بڑی ہی ذلیل حرکت ہے کہ وہ قرآن کے صریح احکام کی خلاف ورزی بھی کرے اور پھر ڈھٹائی کے ساتھ یہ بھی کہے کہ یہ "اسلام کی روح" ہے جو میں نے نکال لی ہے۔ آخر وہ اسلام کی کونسی روح ہے جو قرآن وسنت کے باہر کسی جگہ ان لوگوں کو مل جاتی ہے۔

۹۸۔ یہ اشارہ ہے اُن الزام تراشیوں کی طرف جو اُس زمانے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کی جا رہی تھیں اور کفار و منافقین کے ساتھ بعض ضعیف الایمان مسلمان بھی ان میں حصہ لینے لگے تھے۔

کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ تم خواہ کوئی بات ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ کو ہر بات کا علم ہے۔[۱۰۰]

ازواجِ نبی کے لیے اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے باپ، ان کے بیٹے، ان کے بھائی، ان کے بھتیجے، ان کے بھانجے،[۱۰۱] ان کے میل جول کی عورتیں[۱۰۲] اور ان کے مملوک[۱۰۳] گھروں میں آئیں۔ انہیں اللہ کی نافرمانی سے پرہیز کرنا چاہیے، اللہ ہر چیز پر نگاہ رکھتا ہے۔[۱۰۴]

اللہ اور اس کے ملائکہ نبی پر درود بھیجتے ہیں،[۱۰۵] اے لوگو جو ایمان لائے ہو، تم بھی ان پر درود و سلام

۹۹؎ یہ تشریح ہے اُس ارشاد کی جو آغاز سورہ میں گزر چکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں اہل ایمان کی مائیں ہیں۔

۱۰۰؎ یعنی اگر حضور کے خلاف دل میں بھی کوئی بُرا خیال کوئی شخص رکھے گا، یا آپ کی ازواج کے متعلق کسی کی نیت میں بھی کوئی برائی چھپی ہوگی تو اللہ تعالیٰ سے وہ چھپی نہ رہے گی اور وہ اس پر سزا پائے گا۔

۱۰۱؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نور حواشی نمبر ۳۸ تا ۴۲۔ اس سلسلے میں علامہ آلوسی کی یہ تشریح بھی قابلِ ذکر ہے کہ "بھائیوں، بھانجوں اور بھتیجوں کے حکم میں وہ سب رشتہ دار آجاتے ہیں جو ایک عورت کے لیے حرام ہوں، خواہ وہ نسبی رشتہ دار ہوں یا رضاعی۔ اس فہرست میں چچا اور ماموں کا ذکر اس لیے نہیں کیا گیا کہ وہ عورت کے لیے بمنزلۂ والدین ہیں۔ یا پھر ان کے ذکر کو اس لیے ساقط کر دیا گیا کہ بھانجوں اور بھتیجوں کا ذکر آجانے کے بعد اُن کے ذکر کی حاجت نہیں ہے، کیونکہ بھانجے اور بھتیجے سے پردہ نہ ہونے کی جو وجہ ہے وہی چچا اور ماموں سے پردہ نہ ہونے کی وجہ بھی ہے۔" (روح المعانی)

۱۰۲؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نور حاشیہ نمبر ۴۳۔

۱۰۳؎ تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفسیر سورۂ نور حاشیہ نمبر ۴۴۔

۱۰۴؎ اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس حکمِ قطعی کے آجانے کے بعد آیندہ کسی ایسے شخص کو گھروں میں بے حجاب آنے کی اجازت نہ دی جائے جو ان مستثنیٰ رشتہ داروں کے دائرے سے باہر ہو۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ خواتین کو یہ روش ہرگز نہ اختیار کرنی چاہیے کہ وہ شوہر کی موجودگی میں تو پردے کی پابندی کریں مگر جب وہ موجود نہ ہو تو غیر محرم مردوں کے سامنے پردہ اُٹھا دیں۔ ان کا یہ فعل چاہے ان کے شوہر سے چھپا رہ جائے،

بھیجو۔[105] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت

خدا سے تو نہیں چھپ سکتا۔

[105] اللہ کی طرف سے اپنے نبی پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ پر بے حد مہربان ہے، آپ کی تعریف فرماتا ہے، آپ کے کام میں برکت دیتا ہے، آپ کا نام بلند کرتا ہے اور آپ پر اپنی رحمتوں کی بارش فرماتا ہے۔ ملائکہ کی طرف سے آپ پر صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ سے غایت درجے کی محبت رکھتے ہیں اور آپ کے حق میں اللہ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ آپکو زیادہ سے زیادہ بلند مرتبے عطا فرمائے، آپکے دین کو سربلند کرے، آپکی شریعت کو فروغ بخشے، آپ کو مقام محمود پر پہنچائے۔ سیاق و سباق پر نگاہ ڈالنے سے صاف محسوس ہو جاتا ہے کہ اس سلسلۂ بیان میں یہ بات کس لیے ارشاد فرمائی گئی ہے۔ وقت وہ تھا جب دشمنانِ اسلام اس دینِ مبین کے فروغ پر اپنے دل کی جلن نکالنے کے لیے حضورؐ کے خلاف الزامات کی بوچھاڑ کر رہے تھے اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے تھے کہ اس طرح کیچڑ اچھال کر وہ آپکے اُس اخلاقی اثر کو ختم کر دینگے جس کی بدولت اسلام اور مسلمانوں کے قدم روز بروز بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ ان حالات میں یہ آیت نازل کر کے اللہ تعالیٰ نے دنیا کو یہ بتایا کہ کفار و مشرکین اور منافقین میرے نبی کو بدنام کرنے اور نیچا دکھانے کی جتنی چاہیں کوشش کر دیکھیں، آخر کار وہ منہ کی کھائیں گے، اس لیے کہ میں اُس پر مہربان ہوں اور ساری کائنات کا نظم و نسق جن فرشتوں کے ذریعے چل رہا ہے وہ سب اُس کے حامی اور ثناخواں ہیں۔ وہ اس کی مذمت کر کے کیا پا سکتے ہیں جبکہ میں اس کا نام بلند کر رہا ہوں اور میرے فرشتے اس کی تعریفوں کے چرچے کر رہے ہیں۔ وہ اپنے اوچھے ہتھیاروں سے اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں جبکہ میری رحمتیں اور برکتیں اس کے ساتھ ہیں اور میرے فرشتے شب و روز دعا کر رہے ہیں کہ رب العالمین، محمدؐ کا مرتبہ اور زیادہ اونچا کر اور اس کے دین کو اور زیادہ فروغ دے۔

[106] دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اے لوگو جن کو محمدؐ رسول اللہ کی بدولت راہِ راست نصیب ہوئی ہے، تم ان کی قدر پہچانو اور ان کے احسانِ عظیم کا حق ادا کرو۔ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اس شخص نے تمہیں علم کی روشنی دی۔ تم اخلاق کی پستیوں میں گرے ہوئے تھے، اس شخص نے تمہیں اٹھایا اور اس قابل بنایا کہ آج محسودِ خلائق بنے ہوئے ہو۔ تم وحشت اور حیوانیت میں مبتلا تھے، اس شخص نے تم کو

بہترین انسانی تہذیب سے آراستہ کیا۔ کفر کی دُنیا اسی لیے اس شخص پر خار کھا رہی ہے کہ اس نے یہ احسانات تم پر کیے، ورنہ اس نے کسی کے ساتھ ذاتی طور پر کوئی بُرائی نہ کی تھی۔ اس لیے اب تمہاری احسان شناسی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ جتنا بغض وہ اِس خیرِ مجسّم کے خلاف رکھتے ہیں اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ محبّت تم اس سے رکھو، جتنی وہ اس سے نفرت کرتے ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے گرویدہ ہو جاؤ، جتنی وہ اس کی مذمت کرتے ہیں اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کی تعریف کرو، جتنے وہ اس کے بدخواہ ہیں اتنے ہی بلکہ اس سے زیادہ تم اس کے خیر خواہ بنو اور اس کے حق میں وہی دُعا کرو جو اللہ کے فرشتے شب و روز اس کے لیے کر رہے ہیں کہ اے ربّ دوجہاں، جس طرح تیرے نبی نے ہم پر بے پایاں احسانات فرمائے ہیں، تو بھی ان پر بے حدو حساب رحمت فرما، ان کا مرتبہ دنیا میں بھی سب سے زیادہ بلند کر اور آخرت میں بھی انہیں تمام مقربین سے بڑھ کر تقرّب عطا فرما۔

اس آیت میں مسلمانوں کو دو چیزوں کا حکم دیا گیا ہے۔ ایک صلّوا علیہ۔ دوسرے سلّموا تسلیما۔

صلوٰۃ کا لفظ جب علیٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے تین معنی ہوتے ہیں۔ ایک، کسی پر مائل ہونا، اس کی طرف محبّت کے ساتھ متوجّہ ہونا اور اُس پر جھکنا۔ دوسرے، کسی کی تعریف کرنا۔ تیسرے، کسی کے حق میں دُعا کرنا۔ یہ لفظ جب اللہ تعالیٰ کیلیے بولا جائیگا تو ظاہر ہے کہ تیسرے معنی میں نہیں ہوسکتا، کیونکہ اللہ کا کسی اور سے دُعا کرنا قطعاً ناقابلِ تصوّر ہے۔ اس لیے لامحالہ وہ صرف پہلے دو معنوں میں ہوگا۔ لیکن جب یہ لفظ بندوں کیلیے بولا جائیگا، خواہ وہ فرشتے ہوں یا انسان، تو وہ تینوں معنوں میں ہوگا۔ اسمیں محبّت کا مفہوم بھی ہوگا، مدح و ثنا کا مفہوم بھی اور دُعائے رحمت کا مفہوم بھی۔ لہٰذا اہلِ ایمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں صلّوا علیہ کا حکم دینے کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کے گرویدہ ہو جاؤ، ان کی مدح و ثنا کرو، اور ان کے لیے دُعا کرو۔

سلام کا لفظ بھی دو معنی رکھتا ہے۔ ایک، ہر طرح کی آفات اور نقائص سے محفوظ رہنا، جس کے لیے ہم اُردو میں سلامتی کا لفظ بولتے ہیں۔ دوسرے صلح اور عدم مخالفت۔ پس نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں سلّموا تسلیما کہنے کا ایک مطلب یہ ہے کہ تم ان کے حق میں کامل سلامتی کی دُعا کرو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم پوری طرح دل و جان سے ان کا ساتھ دو، اُن کی مخالفت سے پرہیز کرو، اور ان کے سچے فرمانبردار بن کر رہو۔

یہ حکم جب نازل ہُوا تو متعدد صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ، سلام کا طریقہ تو آپ ہمیں بتا چکے ہیں (یعنی نماز میں السلام علیک ایھا النبی ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ اور ملاقات کے وقت السلام علیک یا رسول اللہ کہنا) مگر آپ پر صلوٰۃ بھیجنے کا طریقہ کیا ہے۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بہت سے لوگوں کو مختلف مواقع پر جو درود سکھائے ہیں وہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں:

کعب بن عُجرہؓ: اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلّیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید وبارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم انک حمید مجید۔ یہ درود تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ حضرت کعب بن عجرہ سے بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، امام احمد، ابن ابی شیبہ، عبدالرزاق، ابن ابی حاتم اور ابن جریر نے روایت کیا ہے۔

ابنِ عباسؓ: ان سے بھی بہت خفیف فرق کے ساتھ وہی درود مروی ہے جو اوپر نقل ہُوا ہے۔ (ابن جریر)

ابو حُمید ساعِدیؓ: اللّٰھم صل علی محمدٍ وازواجہٖ وذرّیتہٖ کما صلّیت علی ابراھیم وبارک علی محمد وازواجہٖ وذرّیتہٖ کما بارکت علی آل ابراھیم انک حمید مجید (مالک، احمد، بخاری، مسلم، نسائی، ابوداؤد، ابنِ ماجہ)

ابو مسعود بدریؓ: اللھم صل علی محمد وعلی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم وعلی آل ابراھیم وبارک علی محمد وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم فی العالمین انک حمید مجید (مالک، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، احمد، ابنِ جریر، ابنِ حبّان، حاکم)

ابو سعید خُدریؓ: اللّٰھم صلّ علی محمدٍ عبدک ورسولک کما صلیت علی ابراھیم وبارک علی محمدٍ وعلی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم (احمد، بخاری، نسائی، ابنِ ماجہ)

بُریدۃ الخزاعی: اللھم اجعل صلوٰتک ورحمتک وبرکاتک علی محمدٍ وعلی آل محمدٍ کما جعلتھا علی ابراھیم انک حمید مجید (احمد، عبد بن حمید، ابن مردُویہ)

ابو ہریرہؓ: اللّٰھم صلّ علی محمدٍ وعلی آل محمدٍ وبارک علی محمدٍ وعلی آل محمدٍ کما صلّیت وبارکت علی ابراھیم وآل ابراھیم فی العالمین انک حمید مجید (نسائی)

حضرت طلحہؓ: اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم انک حمید مجید و بارک علی محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم انک حمید مجید (ابن جریر)

یہ تمام درود الفاظ کے اختلاف کے باوجود معنی میں متفق ہیں۔ اِن کے اندر چند اہم نکات ہیں جنہیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے:

اولاً، ان سب میں حضورؐ نے مسلمانوں سے فرمایا ہے کہ مجھ پر درود بھیجنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو کہ اے خدا، تو محمدؐ پر درود بھیج۔ نادان لوگ جنہیں معنی کا شعور نہیں ہے اس پر فوراً یہ اعتراض جڑ دیتے ہیں کہ یہ تو عجیب بات ہوئی، اللہ تعالیٰ تو ہم سے فرما رہا ہے کہ تم میرے نبی پر درود بھیجو، مگر ہم اُلٹا اللہ سے کہتے ہیں کہ تو درود بھیج۔ حالانکہ دراصل اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو یہ بتایا ہے کہ تم مجھ پر "صلوٰۃ" کا حق ادا کرنا چاہو بھی تو نہیں کر سکتے، اس لیے اللہ ہی سے دُعا کرو کہ وہ مجھ پر صلوٰۃ فرمائے۔ ظاہر بات ہے کہ ہم حضورؐ کے مراتب بلند نہیں کر سکتے۔ اللہ ہی بلند کر سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے احسانات کا بدلہ نہیں دے سکتے، اللہ ہی ان کا اجر دے سکتا ہے۔ ہم حضورؐ کے رفعِ ذکر کے لیے اور آپ کے دین کو فروغ دینے کے لیے خواہ کتنی ہی کوشش کریں، اللہ کے فضل اور اس کی توفیق و تائید کے بغیر اُس میں کوئی کامیابی نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ حضورؐ کی محبت و عقیدت بھی ہمارے دل میں اللہ ہی کی مدد سے جاگزین ہو سکتی ہے ورنہ شیطان نہ معلوم کتنے وساوس دل میں ڈال کر ہمیں آپ سے منحرف کر سکتا ہے، اعاذنا اللہ من ذالک۔ لہٰذا حضورؐ پر صلوٰۃ کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ اللہ سے آپ پر صلوٰۃ کی دُعا کی جائے۔ جو شخص اللّٰھم صلّ علی محمّد کہتا ہے وہ گویا اللہ کے حضور اپنے عجز کا اعتراف کرتے ہوئے عرض کرتا ہے کہ خدایا، تیرے نبی پر صلوٰۃ کا جو حق ہے اسے ادا کرنا میرے بس میں نہیں ہے، تو ہی میری طرف سے اس کو ادا کر اور مجھ سے اس کے ادا کرنے میں جو خدمت چاہے لے لے۔

ثانیاً، حضورؐ کی شانِ کرم نے یہ گوارا نہ فرمایا کہ تنہا اپنی ہی ذات کو اس دُعا کے لیے مخصوص فرمالیں، بلکہ اپنے ساتھ اپنی آل اور ازواج اور ذرّیّت کو بھی آپ نے شامل کر لیا۔ ازواج اور ذرّیّت کے معنی تو ظاہر ہیں۔ رہا آل کا لفظ، تو وہ محض حضورؐ کے خاندان والوں کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں وہ سب لوگ آجاتے

ہیں جو آپ کے پیرو ہوں اور آپ کے طریقے پر چلیں۔ عربی لغت کی رُو سے آل اور اہل میں فرق یہ ہے کہ کسی شخص کی آل وہ سب لوگ سمجھے جاتے ہیں جو اس کے ساتھی، مددگار اور متبع ہوں، خواہ وہ اس کے رشتہ دار ہوں یا نہ ہوں۔ اور کسی شخص کے اہل وہ سب لوگ کہے جاتے ہیں جو اس کے رشتہ دار ہوں، خواہ وہ اس کے ساتھی اور متبع ہوں یا نہ ہوں۔ قرآن مجید میں ۱۴ مقامات پر آلِ فرعون کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ان میں سے کسی جگہ بھی آل سے مراد محض فرعون کے خاندان والے نہیں ہیں بلکہ وہ سب لوگ ہیں جو حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اس کے ساتھی تھے۔ (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو سورۂ بقرہ آیات ۴۹-۵۰۔ آل عمران، ۱۱۔ الاعراف، ۱۳۰۔ المومن، ۴۶) پس آلِ محمدؐ سے ہر وہ شخص خارج ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر نہ ہو، خواہ وہ خاندانِ رسالت ہی کا ایک فرد ہو، اور اس میں ہر وہ شخص داخل ہے جو حضور کے نقشِ قدم پر چلتا ہو، خواہ وہ حضور سے کوئی دور کا بھی نسبی تعلق نہ رکھتا ہو۔ البتہ خاندانِ رسالت کے وہ افراد بدرجۂ اولیٰ آلِ محمد ہیں جو آپ سے نسبی تعلق بھی رکھتے ہیں اور آپ کے پیرو بھی ہیں۔

ثالثاً، ہر درود جو حضور نے سکھایا ہے اس میں یہ بات ضرور شامل ہے کہ آپ پر ویسی ہی مہربانی فرمائی جائے جیسی ابراہیمؑ اور آلِ ابراہیم پر فرمائی گئی ہے۔ اس مضمون کو سمجھنے میں لوگوں کو بڑی مشکل پیش آئی ہے۔ اس کی مختلف تاویلیں علماء نے کی ہیں۔ مگر کوئی تاویل دل کو نہیں لگتی۔ میرے نزدیک صحیح تاویل یہ ہے (والعلم عند اللہ) کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم پر ایک خاص کرم فرمایا ہے جو آج تک کسی پر نہیں فرمایا، اور وہ یہ ہے کہ تمام وہ انسان جو نبوّت اور وحی اور کتاب کو ماخذِ ہدایت مانتے ہیں وہ حضرت ابراہیم کی پیشوائی پر متفق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا عیسائی یا یہودی۔ لہٰذا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا منشاء یہ ہے کہ جس طرح حضرت ابراہیم کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے پیروؤں کا مرجع بنایا ہے اسی طرح مجھے بھی بنادے۔ اور کوئی ایسا شخص جو نبوّت کا ماننے والا ہو، میری نبوّت پر ایمان لانے سے محروم نہ رہ جائے۔

یہ امر کہ حضور پر درود بھیجنا سنّتِ اسلام ہے، جب آپ کا نام آئے اس کا پڑھنا مستحب ہے، اور خصوصاً نماز میں اس کا پڑھنا مسنون ہے، اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے۔ اس امر پر بھی اجماع ہے کہ عمر میں ایک مرتبہ حضور پر درود بھیجنا فرض ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صاف الفاظ میں اس کا حکم دیا ہے۔ لیکن اس کے بعد درود کے مسئلے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

امام شافعی اس بات کے قائل ہیں کہ نماز میں آخری مرتبہ جب آدمی تشہّد پڑھتا ہے اُس میں صلوٰۃ علی النبی پڑھنا فرض ہے، اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی۔ صحابہ میں سے ابنِ مسعود، ابومسعود انصاری، ابن عمر اور جابر بن عبداللہ، تابعین میں سے شعبی، امام محمد باقر، محمد بن کعب قرظی اور مقاتل بن حیّان، اور فقہاء میں سے اسحاق بن رَاہُوَیہ کا بھی یہی مسلک تھا، اور آخر میں امام احمد بن حنبل نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا۔

امام ابوحنیفہ، امام مالک اور جمہور علماء کا مسلک یہ ہے کہ درود عمر میں صرف ایک مرتبہ پڑھنا فرض ہے۔ یہ کلمۂ شہادت کی طرح ہے کہ جس نے ایک مرتبہ اللہ کی الٰہیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کر لیا اس نے فرض ادا کر دیا۔ اسی طرح جس نے ایک دفعہ درود پڑھ لیا وہ فریضۂ صلوٰۃ علی النبی سے سبکدوش ہو گیا۔ اس کے بعد نہ کلمہ پڑھنا فرض ہے نہ درود۔

ایک اور گروہ نماز میں اس کا پڑھنا مطلقاً واجب قرار دیتا ہے مگر تشہد کے ساتھ اس کو مقیّد نہیں کرتا۔ ایک دوسرے گروہ کے نزدیک ہر دُعا میں اس کا پڑھنا واجب ہے۔ کچھ اور لوگ اس کے قائل ہیں کہ جب بھی حضور کا نام آئے، درود پڑھنا واجب ہے۔ اور ایک گروہ کے نزدیک ایک مجلس میں حضور کا ذکر خواہ کتنی ہی مرتبہ آئے، درود پڑھنا بس ایک دفعہ واجب ہے۔

یہ اختلافات صرف وجوب کے معاملہ میں ہیں۔ باقی رہی درود کی فضیلت، اور اس کا موجب اجر و ثواب ہونا، اور اس کا ایک بہت بڑی نیکی ہونا، تو اس پر ساری اُمت متفق ہے۔ اس میں کسی ایسے شخص کو کلام نہیں ہو سکتا جو ایمان سے کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو۔ درود تو فطری طور پر ہر اس مسلمان کے دل سے نکلے گا جسے یہ احساس ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے بعد ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ اسلام اور ایمان کی جتنی قدر انسان کے دل میں ہوگی اتنی ہی زیادہ قدر اس کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے احسانات کی بھی ہوگی، اور جتنا زیادہ آدمی ان احسانات کا قدر شناس ہوگا اتنا ہی زیادہ وہ حضور پر درود بھیجے گا۔ پس درحقیقت کثرتِ درود ایک پیمانہ ہے جو ناپ کر بتا دیتا ہے کہ دینِ محمدؐ سے ایک آدمی کتنا گہرا تعلق رکھتا ہے اور نعمتِ ایمان کی کتنی قدر اس کے دل میں ہے۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مَن صلّٰی علیّ صلوٰۃً لم تزل الملائکۃ تصلّی علیہ ما صلّی علیّ (احمد و ابن ماجہ) "جو شخص مجھ پر درود بھیجتا ہے ملائکہ اس پر درود بھیجتے

رہتے ہیں جب تک وہ مجھ پر درود بھیجتا رہے"۔ من صلّی علیّ واحدۃً صلی اللہ علیہ عشراً (مسلم) "جو مجھ پر ایک بار درود بھیجتا ہے اللہ اس پر دس بار درود بھیجتا ہے"۔ اولی الناس بی یوم القیمۃ اکثرھم علیّ صلوۃ (ترمذی) "قیامت کے روز میرے ساتھ رہنے کا سب سے زیادہ مستحق وہ ہوگا جو مجھ پر سب سے زیادہ درود بھیجے گا"۔ البخیل الذی ذُکِرتُ عندہ فلم یصلّ علیّ۔ (ترمذی) "بخیل ہے وہ شخص جس کے سامنے میرا ذکر کیا جائے اور وہ مجھ پر درود نہ بھیجے"۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دوسروں کے لیے اللّٰھم صلّ علی فلان، یا صلی اللہ علیہ وسلم، یا اسی طرح کے دوسرے الفاظ کے ساتھ صلوٰۃ جائز ہے یا نہیں، اس میں علماء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک گروہ، جس میں قاضی عیاض سب سے زیادہ نمایاں ہیں، اسے مطلقاً جائز رکھتا ہے۔ ان لوگوں کا استدلال یہ ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے خود غیر انبیاء پر صلوٰۃ کی متعدد مقامات پر تصریح کی ہے۔ مثلاً اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ صَلَوٰتٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَرَحۡمَۃٌ (البقرہ۔ ۱۵۷) خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَتُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا وَصَلِّ عَلَیۡہِمۡ۔ (التوبہ۔ ۱۰۳)۔ ہُوَ الَّذِیۡ یُصَلِّیۡ عَلَیۡکُمۡ وَمَلٰٓئِکَتُہٗ (الاحزاب۔ ۴۳) اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی متعدد مواقع پر لفظ صلوٰۃ کے ساتھ غیر انبیاء کو دعا دی ہے۔ مثلاً ایک صحابی کے لیے آپ نے دعا فرمائی کہ اللھم صل علی آل ابی اوفٰی۔ حضرت جابر بن عبداللہ کی بیوی کی درخواست پر فرمایا، صلی اللہ علیکِ وعلیٰ زوجکِ۔ جو لوگ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوتے ان کے حق میں آپ فرماتے اللھم صلِّ علیھم۔ حضرت سعد بن عُبادہ کے حق میں آپ نے فرمایا، اللھم اجعل صلوٰتک ورحمتک علیٰ آل سعد بن عُبادہ۔ اور مومن کی روح کے متعلق حضورؐ نے خبر دی کہ ملائکہ اس کے حق میں دعا کرتے ہیں صلی اللہ علیک وعلیٰ جسدک۔ لیکن جمہورِ امت کے نزدیک ایسا کرنا درست نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اب یہ اہلِ اسلام کا شعار بن چکا ہے کہ وہ صلوٰۃ وسلام کو انبیاء علیہم السلام کے لیے خاص کرتے ہیں اس لیے غیر انبیاء کے لیے اس کے استعمال سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسی بنا پر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ایک مرتبہ اپنے ایک عامل کو لکھا تھا کہ "میں نے سنا ہے کچھ واعظین نے یہ نیا طریقہ شروع کیا ہے کہ وہ صلوٰۃ علی النبی کی طرح اپنے سرپرستوں اور حامیوں کے لیے بھی صلوٰۃ کا لفظ استعمال کرنے لگے ہیں۔ میرا یہ خط پہنچنے کے بعد ان لوگوں کو اس فعل سے روک دو اور

فرمائی ہے اور ان کے لیے رسوا کن عذاب مہیا کر دیا ہے[۱۱۰]۔ اور جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بے قصور اذیت دیتے ہیں انہوں نے ایک بڑے بہتان[۱۱۱] اور صریح گناہ کا وبال اپنے سر لے لیا ہے۔

اے نبی، اپنی بیویوں اور بیٹیوں اور اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دو کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کے پلو لٹکا لیا کریں[۱۱۲]۔ یہ زیادہ مناسب طریقہ ہے تاکہ وہ پہچان لی جائیں اور نہ ستائی

انہیں حکم دو کہ وہ صلوٰۃ کو انبیاء کے لیے مخصوص رکھیں اور دوسرے مسلمانوں کے حق میں دعا پر اکتفا کریں۔" (روح المعانی)

[۱۱۰] اللہ کو اذیت دینے سے مراد دو چیزیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی نافرمانی کی جائے، اس کے مقابلے میں کفر و شرک اور دہریت کا رویہ اختیار کیا جائے، اور اس کے حرام کو حلال کر لیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اس کے رسول کو اذیت دی جائے، کیونکہ جس طرح رسول کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے، اسی طرح رسول پر طعن خدا پر طعن ہے، رسول کی مخالفت خدا کی مخالفت ہے، اور رسول کی نافرمانی خدا کی نافرمانی ہے۔

[۱۱۱] یہ آیت بہتان کی تعریف متعین کر دیتی ہے، یعنی جو عیب آدمی میں نہ ہو، یا جو قصور آدمی نے نہ کیا ہو وہ اس کی طرف منسوب کرنا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کی تصریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد اور ترمذی کی روایت ہے کہ حضورؐ سے پوچھا گیا غیبت کیا ہے۔ فرمایا ذکرك اخاك بما یکرہ "تیرا اپنے بھائی کا ذکر اس طرح کرنا جو اسے ناگوار ہو"۔ عرض کیا گیا اور اگر میرے بھائی میں وہ عیب موجود ہو۔ فرمایا ان کان فیہ ما تقول فقد اغتبتہ وان لم یکن فیہ ما تقول فقد بھتّہ "اگر اس میں وہ عیب موجود ہے جو تو نے بیان کیا تو تو نے اس کی غیبت کی۔ اور اگر وہ اس میں نہیں ہے تو تو نے اس پر بہتان لگایا"۔ یہ فعل صرف ایک اخلاقی گناہ ہی نہیں ہے جس کی سزا آخرت میں ملنے والی ہو۔ بلکہ اس آیت کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ریاست کے قانون میں بھی جھوٹے الزامات لگانے کو جرم مستلزم سزا قرار دیا جائے۔

[۱۱۲] اصل الفاظ ہیں یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ۔ جلباب عربی زبان میں بڑی چادر کو کہتے ہیں۔ اور اِدناء کے اصل معنی قریب کرنے اور لپیٹ لینے کے ہیں، مگر جب اس کے ساتھ علیٰ کا صلہ

آئے تو اس میں اِرخاء، یعنی اوپر سے لٹکا لینے کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ موجودہ زمانے کے بعض مترجمین و مفسرین مغربی مذاق سے مغلوب ہو کر اس لفظ کا ترجمہ صرف "لپیٹ لینا" کرتے ہیں تاکہ کسی طرح چہرہ چھپانے کے حکم سے بچ نکلا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا مقصود اگر وہی ہوتا جو یہ حضرات بیان کرنا چاہتے ہیں تو وہ یُدْنِیْنَ اِلَیْھِنَّ فرماتا۔ جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ کبھی یہ نہیں مان سکتا کہ یدنین علیھن کے معنی محض لپیٹ لینے کے ہو سکتے ہیں۔ مزید براں مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ کے الفاظ یہ معنی لینے میں اور زیادہ مانع ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہاں مِنْ تبعیض کے لیے ہے، یعنی چادر کا ایک حصہ۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ لپیٹی جائے گی تو پوری چادر لپیٹی جائے گی نہ کہ اس کا محض ، ایک حصہ۔ (۳۰) لیے آیت کا صاف مفہوم یہ ہے کہ عورتیں اپنی چادریں اچھی طرح اوڑھ لپیٹ کر اُن کا ایک حصہ، یا آن کا پلّو اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں، جسے عرفِ عام میں گھونگھٹ ڈالنا کہتے ہیں۔

یہی معنی عہدِ رسالت سے قریب ترین زمانے کے اکابر مفسرین بیان کرتے ہیں۔ ابنِ جریر اور ابن المنذر کی روایت ہے کہ محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عُبَیدۃ السّلمانی سے اس آیت کا مطلب پوچھا۔ (یہ حضرت عُبَیدہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مسلمان ہو چکے تھے مگر حاضرِ خدمت نہ ہو سکے تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مدینہ آئے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ انہیں فقہ اور قضاء میں قاضی شُرَیح کا ہم پلّہ مانا جاتا تھا)۔ اُنہوں نے جواب میں کچھ کہنے کے بجائے اپنی چادر اُٹھائی اور اسے اس طرح اوڑھا کہ پورا سر اور پیشانی اور پورا مُنہ ڈھانک کر صرف ایک آنکھ کھلی رکھی۔ ابنِ عباس بھی قریب قریب یہی تفسیر کرتے ہیں۔ اُن کے جو اقوال ابنِ جریر، ابنِ ابی حاتم اور ابنِ مَردُویَہ نے نقل کیے ہیں ان میں وہ کہتے ہیں "اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ کسی کام کے لیے گھروں سے نکلیں تو اپنی چادروں کے پلّو اوپر سے ڈال کر اپنا مُنہ چھپا لیں اور صرف آنکھیں کھلی رکھیں"۔ یہی تفسیر قتادہ اور سُدّی نے بھی اس آیت کی بیان کی ہے۔

عہدِ صحابہ و تابعین کے بعد جتنے بڑے بڑے مفسرین تاریخ اسلام میں گزرے ہیں اُنہوں نے بالاتفاق اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے۔ امام ابنِ جریر طبری کہتے ہیں: یُدنین علیھن من جلابیبھن یعنی شریف عورتیں اپنے لباس میں لونڈیوں سے مشابہ بن کر گھروں سے نہ نکلیں کہ ان کے چہرے اور سر کے

بال کھلے ہوئے ہوں، بلکہ انہیں چاہیے کہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں تاکہ کوئی فاسق ان کو چھیڑنے کی جرأت نہ کرے۔" (جامع البیان جلد ۲۲۔ ص ۳۳)

علامہ ابوبکر جصاص کہتے ہیں: "یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ جوان عورت کو اجنبیوں سے اپنا چہرہ چھپانے کا حکم ہے اور اسے گھر سے نکلتے وقت ستر اور عفت مآبی کا اظہار کرنا چاہیے تاکہ مشتبہ سیرت و کردار کے لوگ اُسے دیکھ کر کسی طمع میں مبتلا نہ ہوں۔" (احکام القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۸)

علامہ زمخشری کہتے ہیں: "یدنین علیھن من جلابیبھن۔ یعنی وہ اپنے اوپر اپنی چادروں کا ایک حصہ لٹکا لیا کریں اور اس سے اپنے چہرے اور اپنے اطراف کو اچھی طرح ڈھانک لیں۔" (الکشاف۔ جلد ۲، ص ۲۲۱)

علامہ نظام الدین نیشاپوری کہتے ہیں: "یدنین علیھن من جلابیبھن، یعنی اپنے اوپر چادر کا ایک حصہ لٹکا لیں۔ اس طرح عورتوں کو سر اور چہرہ ڈھانکنے کا حکم دیا گیا ہے۔" (غرائب القرآن جلد ۲۲، ص ۳۲)

امام رازی کہتے ہیں: "اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ بدکار عورتیں نہیں ہیں۔ کیونکہ جو اپنا چہرہ چھپائے گی، حالانکہ چہرہ ستر میں داخل نہیں ہے، اس سے کوئی شخص یہ توقع نہیں کر سکتا کہ وہ اپنا ستر غیر کے سامنے کھولنے پر راضی ہوگی۔ اس طرح ہر شخص جان لیگا کہ یہ باپردہ عورتیں ہیں، ان سے زنا کی اُمید نہیں کی جا سکتی۔" (تفسیر کبیر، جلد ۶، ص ۵۹۱)

ضمناً ایک اور مضمون جو اس آیت سے نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی بیٹیاں ثابت ہوتی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ فرما رہا ہے "اے نبی اپنی بیویوں اور بیٹیوں سے کہو"۔ یہ الفاظ اُن لوگوں کے قول کی قطعی تردید کر دیتے ہیں جو خدا سے بے خوف ہو کر بے تکلف یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا تھیں اور باقی صاحبزادیاں حضور کی اپنی صُلبی بیٹیاں نہ تھیں بلکہ گیرڑ تھیں۔ یہ لوگ تعصب میں اندھے ہو کر یہ بھی نہیں سوچتے کہ اولادِ رسولؐ کے نسب سے انکار کر کے وہ کتنے بڑے جُرم کا ارتکاب کر رہے ہیں اور اس کی کیسی سخت جواب دہی انہیں آخرت میں کرنی ہوگی۔ تمام معتبر روایات اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے حضور کی صرف ایک بیٹی حضرت فاطمہ رض

جائیں[۱۱۵]۔ اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے[۱۱۶]۔

ہی نہ تھیں بلکہ تین اور بیٹیاں بھی تھیں حضور کے قدیم ترین سیرت نگار محمد بن اسحاق حضرت خدیجہ سے حضور کے نکاح کا ذکر کرنے کے بعد کہتے ہیں: "ابراہیم کے سوا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد انہی کے بطن سے ہوئی اور ان کے نام یہ ہیں۔ قاسم، او طاہر و طیب، اور زینب، اور رقیہ، اور ام کلثوم، اور فاطمہ" (سیرت ابن ہشام جلد اوّل۔ ص ۲۰۲)۔ مشہور ماہر علم انساب ہشام بن محمد بن السائب کلبی کا بیان ہے کہ: "مکہ میں نبوت سے قبل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں سب سے پہلے قاسم پیدا ہوئے، پھر زینب، پھر رقیہ، پھر فاطمہ، پھر ام کلثوم (طبقات ابن سعد، جلد اوّل، ص ۱۳۳)۔ ابن حزم نے جوامع السیرۃ میں لکھا ہے کہ حضرت خدیجہ کے بطن سے حضور کی چار لڑکیاں تھیں، سب سے بڑی حضرت زینبؓ ان سے چھوٹی رقیہ، ان سے چھوٹی فاطمہ اور ان سے چھوٹی ام کلثوم (ص ۳۸۔ ۳۹)۔ طبری، ابن سعد، ابوجعفر محمد بن حبیب صاحب کتاب المحبّر اور ابن عبدالبر صاحب کتاب الاستیعاب، مستند حوالوں سے بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے حضرت خدیجہ کے دو شوہر گزر چکے تھے۔ ایک ابو ہالہ تمیمی جس سے ان کے ہاں ہند بن ابی ہالہ پیدا ہوئے۔ دوسرے عتیق بن عائذ مخزومی جس سے ان کے ہاں ایک لڑکی ہند نامی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ان کا نکاح حضور سے ہوا اور تمام علمائے انساب متفق ہیں کہ آپ کی صلب سے ان کے ہاں وہ چاروں صاحبزادیاں پیدا ہوئیں جن کے نام اوپر مذکور ہوئے ہیں (ملاحظہ ہو طبری، جلد ۲، ص ۴۱۱۔ طبقات ابن سعد، جلد ۸، ص ۱۴ تا ۱۶۔ کتاب المحبّر ص ۷۸، ۷۹، ۴۵۲۔ الاستیعاب جلد ۲، ص ۷۱۸) ان تمام بیانات کو قرآن مجید کی یہ تصریح قطعی الثبوت بنا دیتی ہے کہ حضور کی ایک ہی صاحبزادی نہ تھیں بلکہ کئی صاحبزادیاں تھیں۔

[۱۱۵] "پہچان لی جائیں" سے مراد یہ ہے کہ ان کو اس سادہ اور حیادار لباس میں دیکھ کر ہر دیکھنے والا جان لے کہ وہ شریف اور باعصمت عورتیں ہیں، آوارہ اور کھلاڑی نہیں ہیں کہ کوئی بدکردار انسان ان سے اپنے دل کی تمنا پوری کرنے کی امید کر سکے۔ نہ "ستائی جائیں" سے مراد یہ ہے کہ ان کو نہ چھیڑا جائے، ان سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس مقام پر ذرا ٹھیر کر یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ قرآن کا یہ حکم، اور وہ مقصد حکم جو اللہ تعالیٰ نے خود بیان کر دیا ہے اسلامی قانون معاشرت کی کیا روح ظاہر کر رہا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ نور، آیت ۳۱ میں یہ ہدایت گزر چکی ہے کہ عورتیں اپنی آرائش و زیبائش کو فلاں فلاں قسم کے مردوں اور عورتوں کے سوا کسی کے سامنے ظاہر نہ کریں۔" اور

زمین پر پاؤں مارتی ہوئی بھی نہ چلیں کہ لوگوں کو اُس زینت کا علم ہو جو اُنہوں نے چھپا رکھی ہے"۔ اُس حکم کے ساتھ اگر سورۂ احزاب کی اِس آیت کو ملا کر پڑھا جائے تو صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں چادر اوڑھنے کا جو حکم ارشاد ہوا ہے اس کا منشا اجنبیوں سے زینت چھپانا ہی ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ منشا اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے جبکہ چادر بجائے خود سادہ ہو، ورنہ ایک مزین اور جاذبِ نظر کپڑا لپیٹ لینے سے تو یہ منشا اُلٹا اور فوت ہو جائے گا۔ اس پر مزید یہ کہ اللہ تعالیٰ صرف چادر لپیٹ کر زینت چھپانے ہی کا حکم نہیں دے رہا ہے بلکہ یہ بھی فرما رہا ہے کہ عورتیں چادر کا ایک حصہ اپنے اوپر سے لٹکا لیا کریں۔ کوئی معقول آدمی اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں لے سکتا کہ اس سے مقصود گھونگھٹ ڈالنا ہے تاکہ جسم و لباس کی زینت چھپنے کے ساتھ ساتھ چہرہ بھی چھپ جائے۔ پھر اس حکم کی علّت اللہ تعالیٰ خود یہ بیان فرماتا ہے کہ یہ وہ مناسب ترین طریقہ ہے جس سے مُسلمان خواتین پہچان لی جائیں گی اور اذیّت سے محفوظ رہیں گی۔ اس سے خود بخود یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ ہدایت اُن عورتوں کو دی جا رہی ہے جو مَردوں کی چھیڑ چھاڑ اور ان کی نظر بازی اور ان کے شہوانی التفات سے لذّت اندوز ہونے کے بجائے اس کو اپنے لیے تکلیف دہ اور اذیّت ناک محسوس کرتی ہیں، جو معاشرے میں اپنے آپ کو آبرو باختہ شمعِ انجمن قسم کی عورتوں میں شمار نہیں کرانا چاہتیں، بلکہ عفت مآب چراغِ خانہ ہونے کی حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہیں۔ ایسی شریف اور نیک خواتین سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر تم فی الواقع اس حیثیت سے معروف ہونا چاہتی ہو اور مَردوں کی ہوسناک توجّہات حقیقت میں تمہارے لیے موجبِ لذّت نہیں بلکہ موجبِ اذیّت ہیں تو پھر اس کے لیے مناسب طریقہ یہ نہیں ہے کہ تم خوب بناؤ سنگھار کر کے پہلی رات کی دُلہن بن کر گھروں سے نکلو اور دیکھنے والوں کی حریص نگاہوں کے سامنے اپنا حُسن اچھی طرح نکھار نکھار کر پیش کرو، بلکہ اِس غرض کے لیے تو مناسب ترین طریقہ یہی ہو سکتا ہے کہ تم ایک سادہ چادر میں اپنی ساری آرائش و زیبائش کو چھپا کر نکلو، اپنے چہرے پر گھونگھٹ ڈالو، اور اس طرح چلو کہ زیور کی جھنکار بھی لوگوں کو تمہاری طرف متوجہ نہ کرے۔ جو عورت باہر نکلنے سے پہلے بن ٹھن کر تیار ہوتی ہے اور اس وقت تک گھر سے قدم نہیں نکالتی جب تک سات سنگھار نہ کر لے، اس کی غرض اس کے سوا آخر اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ دُنیا بھر کے مَردوں کے لیے اپنے آپ کو جنّتِ نگاہ بنانا چاہتی ہے اور انہیں خود دعوتِ التفات دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ یہ کہتی ہے کہ دیکھنے والوں کی بھوکی نگاہیں اسے تکلیف دیتی ہیں، اس کے بعد اگر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ معاشرے

کی بیگم" اور "مقبولِ عام خاتون" ہونے کی حیثیت سے معروف نہیں ہونا چاہتی بلکہ عفت مآب گھر گرہستن بن کر رہنا چاہتی ہے تو یہ ایک فریب کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ انسان کا قول اس کی نیت متعین نہیں کرتا بلکہ اس کی اصل نیت وہ ہوتی ہے جو اس کے عمل کی شکل اختیار کرتی ہے۔ لہٰذا جو عورت جاذبِ نظر بن کر غیر مردوں کے سامنے جاتی ہے اس کا یہ عمل خود ظاہر کر دیتا ہے کہ اس کے پیچھے کیا محرکات کام کر رہے ہیں۔ اسی لیے فتنے کے طالب لوگ اس سے وہی توقعات وابستہ کرتے ہیں جو ایسی عورت سے وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ قرآن عورتوں سے کہتا ہے کہ تم بیک وقت چراغِ خانہ اور شمعِ انجمن نہیں بن سکتی ہو۔ چراغِ خانہ بننا ہے تو اُن طور طریقوں کو چھوڑ دو جو شمعِ انجمن بننے کے لیے موزوں ہیں۔ اور وہ طرزِ زندگی اختیار کرو جو چراغِ خانہ بننے میں مددگار ہو سکتا ہے۔

کسی شخص کی ذاتی رائے خواہ قرآن کے موافق ہو یا اس کے خلاف، اور وہ قرآن کی ہدایت کو اپنے لیے ضابطۂ عمل کی حیثیت سے قبول کرنا چاہے یا نہ چاہے، بہرحال اگر وہ تعبیر کی بددیانتی کا ارتکاب نہ کرنا چاہتا ہو تو وہ قرآن کا منشا سمجھنے میں غلطی نہیں کر سکتا۔ وہ اگر منافق نہیں ہے تو صاف صاف یہ مانے گا کہ قرآن کا منشا وہی ہے جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ اس کے بعد جو خلاف ورزی بھی وہ کریگا یہ تسلیم کر کے کرے گا کہ وہ قرآن کے خلاف عمل کر رہا ہے یا قرآن کی ہدایت کو غلط سمجھتا ہے۔

۱۱ یعنی پہلے جاہلیت کی حالت میں جو غلطیاں کی جاتی رہی ہیں اللہ اپنی مہربانی سے ان کو معاف کر دیگا بشرطیکہ اب صاف صاف ہدایت مل جانے کے بعد تم اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو اور بیان بوجہ کر اس کی خلاف ورزی نہ کرو۔

مطلق العنان اقتدار کے تحت

محدود مذہبی مناصب

اولین تجربہ ـــــ عباسی دورِ عروج میں

جناب نعیم صدیقی

(۸)

آئیے اس کارنامہ کی عظمت اور گہرائی کا اندازہ چند پہلوؤں سے لیجیے :

(۱) ایک مکمل نظامِ قانون معاشرہ کو اس دور میں زندگی کے ہر ہر شعبے سے متعلق جو مسائل درپیش تھے اور پھر جو امکانی مسائل سامنے آسکتے تھے ان سب کو سامنے رکھ کر کتاب و سنت کے اصولی احکام کو ان پر منطبق کیا گیا۔ محدثین کے مقابلہ میں امام صاحب کی شانِ تفقہ بڑی نمایاں تھی۔ محدثین یا تو حدیث کے اسناد میں زیادہ کاوش کرتے اور یا کسی معاملے میں جو کچھ حکم اس سے دورِ نبوت و صحابہ میں اخذ کر کے استعمال کیا جا چکا ہوتا اسے پیشِ نظر رکھتے۔ امام صاحب کا قانونی دماغ کسی حدیث کے اندر کے ان مضمر احکام کو بھی بیک نظر پا لیتا جو پہلے نمایاں نہ ہو چکے ہوں۔ اس کی ایک واقعاتی مثال سامنے ہے۔ عبید اللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ اعمش کی مجلس میں جہاں امام ابوحنیفہ بھی موجود تھے کسی مستفسر نے کوئی سوال پوچھا۔ اعمش جواب نہ دے سکے۔ اور امام کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے فوراً بتایا کہ اس کا جواب یہ ہے۔ اعمش نے دریافت کیا کہ اس جواب کا ماخذ کیا ہے؟ فرمایا وہی حدیث جو آپ نے ہم سے روایت کی تھی۔ اس پر اعمش نے یہ اعتراف کیا کہ بھئی! ہم تو بس عطار ہیں طبیب تمہیں لوگ ہو[۱]۔ امام کی صلاحیتِ استنباط کو وہ واقعہ بھی واضح کرتا ہے کہ امام نے یہ مسئلہ ترک کر دیا تھا کہ باندی کے آزاد ہو جانے سے اس پر طلاق ہو جاتی ہے اس کے متعلق اعمش نے امام ابو یوسف سے پوچھا کہ آپ کے اساتذہ نے اپنی رائے بدل کیوں لی۔

---

[۱] جامع بیان العلم۔ ج ۲، ص ۱۳۰-۱۳۱۔ ترجمان السنۃ۔ از مولانا محمد بدر عالم میرٹھی۔ ج ۱، ص ۲۳۲-۲۳۳۔

انہوں نے فرمایا کہ حضرت عائشہ کی اس حدیث کی بنا پر جو آپ نے اساتذہ سے بواسطہ ابراہیم و اسود نقل فرمائی تھی کہ بریرہ جب آزاد ہوئیں تو ان کی آزادی طلاق نہیں سمجھی گئی۔ بلکہ ان کو نکاح کے قائم رکھنے یا فسخ کرنے کا اختیار دیا گیا۔[1]

پھر جن معاملات میں واضح احکام اصل ماخذ (کتاب و سنت) میں نہیں تھے ان میں قیاس سے کام لے کر اجتہادی حکم لگایا۔

یہ کام جس میں ۳۰ برس کی مدت لگی تھی اس کی وسعت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ زندگی کے ہزارہا مسائل کے لئے ایسے واضح فروعی احکام متعین ہو گئے جو اصولوں کے چوکھٹے میں ٹھیک ٹھیک نصب ہو جائیں اور ان میں باہمی تعارض نہ ہو۔ خوارزمی کے بیان کے مطابق ان مسائل کی تعداد ۸۳ ہزار تھی۔ امام مالک کا ایک قول ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ۶۰ ہزار مسائل کو لیا۔[2] ایک روایت یہ ہے کہ طے شدہ مسائل کی تعداد ۵ لاکھ تھی جن میں سے ۳۸ ہزار کا تعلق عبادات سے تھا۔[3] کردری کی روایت کے بموجب کوفی کی مجلس تدوین قانون نے ۶ لاکھ مسائل طے کئے اور صاحب کتاب الصیانۃ کا دعویٰ ہے کہ جملہ مسائل ۱۲ لاکھ ۹۰ ہزار تھے۔[4] تعداد مسائل کی روایات کا یہ اختلاف دو وجوہ سے ہو سکتا ہے: ایک یہ کہ کام کے مختلف مراحل پر حاصل کردہ معلومات کو راوی نے آگے پہنچا دیا اور وہ کتابوں میں درج ہوئیں اور دوسرے یہ کہ کسی نے محض بڑے بڑے اصولی مسائل کو شمار کیا اور کسی نے ان کے اجزا کو بھی گنتی میں لے لیا۔

بہرحال یہ ظاہر ہے کہ ۳۰ برس میں ایک وسیع مجلس امام ابوحنیفہ کی سرکردگی میں کاوش کرتی رہی تو مسائل کی تعداد بڑی ہونی ہی چاہئے۔ مگر کارنامہ کا اصل پہلو یہ ہے کہ نہ صرف تمام مسائل ایسے مستحکم دلائل کے ساتھ طے ہوئے کہ معاشرہ میں اور خصوصاً اہلِ علم میں ان کو قبولیت حاصل ہوئی بلکہ تمام جزئی احکام پوری ہم آہنگی کے ساتھ ایک مربوط نظامِ قانون (System of Laws) میں نصب ہو گئے۔ یہ نظام

---

[1] تاریخ خطیب بغدادی۔ ج ۱۳، ص ۳۴۱۔ ترجمان السنۃ۔ ج ۱۔ ص ۲۳۲۔

[2] مناقب موفق۔ ج ۱، ص ۹۶۔

[3] تدوین قانون اسلامی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ

[4] ائمہ اربعہ۔ از مولانا رئیس احمد جعفری۔ ص ۱۷۴۔

قانون ایک درخت کی طرح اپنی جڑوں پر کھڑا ہوا، اس کا تنا تھا، اس کے ٹہنے تھے، اس کی شاخیں تھیں شاخوں کے ساتھ پتے، کونپلیں اور پھر پھول اور کلیاں اپنی اپنی جگہ پر موجود! اس سے پہلے اتنا جامع اور مکمل نظام قانون مرتب شکل میں سامنے نہ تھا۔ قانون نے امام ابو حنیفہ کے ہاتھوں نئی کونپلیں چھوڑیں اور نمایاں وسعت اختیار کرلی اور وہ نئے نئے معاملات پر حاوی ہونے کے قابل ہوگیا۔

معاشرہ میں خلا موجود تھا اور جب اس خلاء کو پُر کرنے کے لئے مکمل تر اور موزوں تر چیز موجود ہوگئی تو امام ابو حنیفہ کی پیٹھ پر کوڑے برسانے اور انہیں خطرناک انقلاب پسند حریف جاننے کے باوجود امام کے مرتب کردہ نظام قانون کو اپنانے پر مجبور ہوگئی۔ امام نے بروقت اس ضرورت کو سمجھا، بروقت اس کی طرف توجہ کی اور پھر اسے پورا کیا تو مرتبۂ کمال پر پورا کیا۔ امام کے آزاد ادارے کا کام ان کے خلوص، ان کی علمی برتری، ان کی مہارتِ فن، ان کے زورِ استدلال اور ان کی خدمتِ بے لوث کی وجہ سے قبولیت عام حاصل کر کے اتنی مضبوط قوت بن گیا کہ مطلق العنان اقتدار کے بس میں نہ رہا کہ اس سے صرفِ نظر کرسکے۔

یوں امام نے اقتدار، نظامِ حیات اور معاشرہ پر بالواسطہ طریق سے اثر انداز ہونے کا نیا راستہ نکالا۔

(۲)، قانون میں سیاسی انقلابی تصورات

امام ابو حنیفہ اور ان کی مجلس تدوین قانون نے جو نظام قانون مرتب کیا تھا وہ محض بے جان قوانین کا مجموعہ نہ تھا بلکہ اس میں امام کے وہ تمام سیاسی و انقلابی تصورات حل ہو گئے جن کو آپ نے کتاب و سنت سے اخذ کیا تھا۔ اسلامی قانون جس کے دائرے میں نظام حکومت کے متعلق تمام دستوری مسائل شروع سے شامل رہے ہیں اپنی خاص سیاسی اہمیت رکھتا ہے۔ محدثین نے اپنے ہاں سیاسی و دستوری معاملات سے تعلق رکھنے والی احادیث کو مجموعوں میں لیا ہے اور سیاسی شعور رکھنے والوں نے تو ایسی روایات کی عنوان بندی بڑے بصیرت آموز طریق سے کی ہے، لیکن ائمہ فقہا نے اپنے اپنے مدارسِ فقہ کا نظام قانون مرتب کرتے ہوئے دستوری و سیاسی بحثوں کو بڑی اہمیت سے پیش نظر رکھا ہے۔ اور قانون کی کتابوں میں اپنے سیاسی تصورات حل کر دیئے ہیں۔ اس معاملہ میں امام اعظم کا کارنامہ خاص فوقیت رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ تو سیاسیات کے مردِ میدان تھے ہی۔ اسلامی سیاست کے متعلق وہی نظریات جو امام کے اقوال میں نمایاں ملتے ہیں،

ان کی مدونہ فقہ میں بھی شامل ہیں اور بعد میں فقہ حنفی کی جتنی کتب لکھی گئی ہیں، امام کے نقطۂ نظر کی عکاسی کرتی ہیں۔ آج بہت سے لوگ جب ملتِ اسلامیہ کے سیاسی نظریات کا جائزہ لینے بیٹھتے ہیں تو امام ابوحنیفہ اور پوری صفِ فقہاء کی طرف ان کی توجہ منعطف ہوتی ہی نہیں کیونکہ براہِ راست سیاست کے موضوع پر لکھی ہوئی ان کی کتابیں موجود نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں بہت سے سیاسی نظریات تفسیر، حدیث اور فقہ کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان کو برآمد کرنے کے لئے بڑی پتّہ ماری کی ضرورت ہے۔ اس پتّہ ماری سے بچنے کے لئے آج کا سہل پسند محقق یا تو سلف کی خالص سیاسی کتابوں کو اُٹھا لیتا ہے اور یا پھر یورپ کے مستشرقین کے ہاں سے ان کا حاصلِ کاوش مستعار لے لیتا ہے۔ حالانکہ نہ ان کی نگاہ پاک ہے نہ قلم صداقت رقم! بہرحال آپ اگر امام مالک اور امام ابوحنیفہ جیسی ہستیوں کو درکنار رکھ کر اسلامی سیاسیات میں کوئی تحقیق کر کے لاتے ہیں تو ایسا ناقص کام پایۂ اعتبار حاصل نہیں کر سکتا۔ ضرورت ہے کہ "امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی" کے بعد کوئی اُٹھے اور امام ابوحنیفہ کے سیاسی تصوّرات پر کارنامۂ تحقیق سامنے لائے۔

امام ابوحنیفہ کے سیاسی نظریات و تصوّرات فقہ حنفی کی ہر بڑی کتاب کے پسِ منظر میں جلوہ گر ملیں گے۔ اُنہوں نے خلافت کے سقوط کے بعد قائم ہونے والے نظام کو سلطنت قرار دے کر سلطان کی جو اصطلاح اختیار کی ہے اور پھر سلطانِ عادل اور سلطانِ ظالم اور سلطانِ فاسق کی مختلف اصطلاحیں متفرع کی ہیں اور ان پر مسائل کی بنا رکھی ہے۔ یہ چیزیں ان کے سیاسی نظریہ کی ترجمان ہیں۔ اسی طرح ادب القاضی کا باب فقہ حنفی کی جس بھی کتاب میں دیکھئے اس میں اسلامی عدلیہ کے نہایت اہم اصول مذکور ملیں گے جن کی بنیاد آزادیٔ عدالت اور مساواتِ عدل کے کلیات پر ہے۔ فی الحقیقت حنفی نظامِ قانون زندگی کے تمام معاملات میں نہ صرف افراد کے درمیان بلکہ حکومت اور معاشرہ کے درمیان حقوق اور فرائض کی حدبندی کرنے والا خطِ عدل کھینچتا ہے اور راقم الحروف کی رائے میں عوام کو سلطان سے قانونی تحفظ دلانے کا اہتمام کیا گیا ہے یعنی حنفی قانون عوام کے پلڑے میں زیادہ وزن ڈال کر اسے حکومت کے پلڑے کے برابر لانے کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ بادشاہت کے نیچے جتنا کچھ بھی تحفظ عوام کے حقوق کا ممکن تھا اور ایک نظامِ جبر کو جتنا بھی پابندِ حدود کیا جا سکتا تھا، اس کی پوری کوشش فقہ

حنفی میں کی گئی ہے۔ یہ کتنا بڑا اجتہاد ہے کہ مطلق العنان فرماں رواؤں کے تسلّط میں رہتے ہوئے امام کی مرتب کردہ فقہ سلطان سے کہتی ہے کہ تم عادل بھی ہو سکتے ہو اور تم ظالم اور فاسق بھی ہو سکتے ہو۔ اور ہم تمہارے سامنے قانون کی یہ کسوٹی رکھ رہے ہیں کہ جس پر پرکھ کر تم خود دیکھ سکتے ہو کہ عادل ہو یا ظالم و فاسق۔ اور تم نہ دیکھوگے تو معاشرہ تمہیں اب اس کسوٹی پر پرکھ کے دیکھے گا۔

ذرا فقہ حنفی کی کسی کتاب میں کتاب الاکراہ کو نکال کر ملاحظہ کیجئے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے کہ اس پر امام ابو حنیفہ کا نظامِ قانون ان کے مخصوص نظریۂ سیاسی کو اجاگر کر سکتا ہے۔ اکراہ وہ فعل ہے کہ جس کے ذریعے ایک شخص دوسرے شخص کو کسی امر پر تخویف سے مجبور کر دیتا ہے اور اس کی رضا مندی کو معدوم یا اس کے اختیار کو فاسد کر دیتا ہے۔[1] اکراہ کی تعریف کے ساتھ ذرا یہ الفاظ دیکھئے:

"..... ما هدد به سلطانا او لصاً او نحوه ....." — یعنی جس امر کے لئے کوئی بادشاہ یا چور ڈاکو وغیرہ خوف دلائے۔[2]

یعنی یہاں بادشاہ (غیر عادل) کو چور اچکوں کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حنفی نظامِ قانون سے کس طرز کی ذہنیت تیار ہوتی ہے۔ خود امام صاحب سے تو یہ قول مروی ہے کہ اکراہ بجز سلطان کے کسی اور سے متحقق ہوتا ہی نہیں (کیونکہ "ان المنعة له القدرة"[3]) مطلب امام کا یہ ہے کہ اور ہر جبر کرنے اور خوف دلانے والے کے مقابلے پر ایک فرد کو سلطان کی حفاظت و حمایت حاصل ہو سکتی ہے اور تلافی کرائی جا سکتی ہے۔ مگر خود سلطان ہی اگر متاعِ رضا و اختیار پر ہاتھ صاف کرنے لگے تو اس سارقِ عظیم کے خلاف سیاسی دائرے میں کہاں فریاد کی جا سکے گی۔ بات اس سے آگے یہاں تک جاتی ہے اور بڑے نکتۂ لطیف تک پہنچاتی ہے کہ امرِ سلطان فی نفسہٖ اکراہ کی تعریف

---

[1] ہدایہ بہ شرح حاجی محمد عبد الحلیم مرحوم، شائع کردہ مطبع مصطفائی بہ سال ۱۲۸۱ھ ج ۲۔ کتاب الاکراہ ص ۲۶۴
غایۃ الاوطار اردو ترجمہ (مترجمہ مولوی خرم علی و محمد احسن صدیقی نانوتوی) شائع کردہ نولکشور بہ سال ۱۹۲۵ء
ج ۴۔ ص ۸۰۔ کتاب الاکراہ۔

[2] غایۃ الاوطار مذکورہ بالا ج ۴۔ ص ۸۱۔ [3] ہدایہ مذکورہ بالا ج ۲۔ ص ۲۶۴۔

میں داخل ہے، چاہے اس کے ساتھ بظاہر کوئی وعید شامل نہ ہو۔ کیونکہ وعید تو ایک محذوف امر معروف ہے۔ اس تصور پر استوار ہونے والے قانون کی دفعات بڑی گہری توجہ چاہتی ہیں۔ اکراہ سے اگر کسی کو کوئی شے بیع کرنے پر مجبور کر دیا گیا ہے تو اگرچہ ظاہری صورت معاملہ کے مطابق لاگو ہونے والا قانون اس بیع کو تسلیم کرے گا، لیکن حالتِ اکراہ سے نکلتے ہی مجبور فرد اس کو فسخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور اس وقت تک اگر شے دست بدست منتقل ہو چکی ہو تو بھی اصل حقدار کو لوٹائی جائے گی اور اس سے اگر نفع کمایا گیا ہو تو وہ بھی اسے ملے گا۔ اور اس میں نقصان کیا گیا ہو تو اسے پورا کر کے دیا جائے گا۔ فریقین میں سے کسی کی موت بھی اس حق فسخ کو باطل نہیں کرتی۔ خوب ذہن نشین رکھئے کہ قانون کے مرتبین کے سامنے عام ظالم افراد سے کہیں بڑھ کر فرماں رواں کی جبر کیشیاں تھیں[۵]۔

کتاب الاکراہ کا اہم ترین مسئلہ وہ ہے جہاں شریعت کے عقائد، عبادات اور محرمات جبریت کی زد پر آتے ہیں۔ جہاں تک جبر سے لحم خنزیر یا شراب جیسے محرمات کے استعمال کا تعلق ہے حنفی قانون مجبور کو مضطر کے حکم میں رکھتا ہے اور اسے اجازت دیتا ہے۔ لیکن عقاید جیسے امور میں جبر کے دو مدارج کے لئے دو مختلف صورتیں تجویز کرتا ہے۔ یعنی اگر نقصانِ جان و عضو کا خطرہ ہو تو کلمۂ کفر بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر محض قید یا ضرب تازیانہ وغیرہ جیسی عقوبتیں سامنے ہوں تو صبر و عزیمت کی راہ اختیار کرنے کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حنفی قانون کے پردے میں اہلِ عزیمت کو امورِ اعتقادیہ اور فرائضِ شرعیہ کی حد تک حکومتِ جبر کے بالمقابل جم جانے کی تلقین کی گئی ہے[۶]۔

اسی طرح ایک اور مسئلہ بڑا اہم ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی دوسرے کے قتل پر مجبور کیا جائے اور وہ قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ اسی طرح جبر کے تحت اگر کوئی شخص زنا کرے تو حد جاری ہو گی۔ (اس میں اختلافی بحث بھی ہے۔ مگر اس سے ہم صرف نظر کرتے ہیں) بظاہر یہ قانون عجیب سا معلوم ہو گا لیکن اس میں بڑی گہری مصلحت ہے جس کے ڈانڈے پھر اس خاص نظریۂ سیاسی سے ملتے ہیں۔

۵۔ ہدایہ و غایۃ الاوطار۔ کتاب الاکراہ۔

۶۔ ایضاً

جس سے امام ابو حنیفہ کا ذہن آراستہ تھا۔ اس قانون کے بموجب کوئی شخص اپنی ذات کی حد تک تو جبر کے تحت کوئی ناپسندیدہ اقدام کر سکتا ہے مگر کوئی ایسا جرم نہیں کر سکتا جو دوسروں کے حقوق کو تباہ کرے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر فرماں روا کسی کو بغیر قانونی جواز کے دوسرے کے قتل کا حکم دے تو حنفی قانون اسے یہ سبق دیتا ہے کہ وہ ایسا حکم ماننے سے انکار کر دے۔ ورنہ اس قانون کی عدالت میں اگر اس کے خلاف دعوےٰ آئے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا۔ گویا اس میں یہ اصول مضمر ہے کہ شہریوں اور خصوصاً ملازمین حکومت کو خلافِ قانون امور میں سلطان یا کسی بڑے عہدہ دار یا کسی دوسرے جابر کی اطاعت اس کے شدید دباؤ کے باوجود نہیں کرنی چاہیے[۱]۔

اب ذرا کتاب الغصب نکال کر دیکھیے۔ اس میں قانون بیان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی مسلم کسی فردِ ذمی کے خنزیر یا اس کی شراب کو تلف کر دے تو تاوان دے۔ لیکن اگر وہ خنزیر یا شراب کسی مسلمان کی ملکیت میں ہو تو اس کے ضائع کرنے پر تاوان نہ ہوگا۔ پہلی صورت میں ذمی کے حقوق کا تحفظ مقدم ہے۔ مگر دوسری صورت میں چونکہ مسلم کو ان چیزوں کی تملیک ہی کا حق نہیں ہے اس لئے نہی عن المنکر کا وہ اصول کام کرے گا جس کے تحت ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو امرِ حرام سے روک سکتا ہے۔ گویا اسلامی قانون خود اپنے خلاف کسی کو کوئی تحفظ نہیں دیتا۔ بلکہ خلاف ورزی کا انسداد کرنے میں ہر مسلم شہری کی تائید چاہتا ہے۔ اس قانون کا تاریخی پسِ منظر ملحوظ رہے کہ منکرات و فواحش خود دربار کی سرپرستی میں پھیلائے جا رہے تھے اور زچ ہو کر حساس عناصر بسا اوقات عشرت پسندوں کے اسباب و آلات وغیرہ کو توڑ دیتے تھے۔ امام احمد بن حنبل کے پیروکاروں نے تو ایک بار خاصی مہم اٹھائی تھی۔ سو حنفی قانون انسدادِ فواحش کی تحریک کا مؤید تھا[۲]۔

اسی طرح جہاد کے موضوع پر حنفی فقہ کی اساسی کتب دیکھیے تو ان کی بحثوں میں نہایت اہم نکات مضمر ہیں۔ بیشتر حنفی علمائے قانون نے کتاب الحدود اور کتاب الجہاد کو مربوط و متصل رکھا ہے، کیونکہ

---

[۱] ہدایہ وعنایۃ الاوطار، کتاب الاکراہ [۲] ملاحظہ ہو ہدایہ، ج ۲، کتاب الغصب، ص ۲۹۷-۲۹۸

دونوں کا مقصود ان کی نگاہ میں ایک ہے۔ یعنی دنیا کو فساد اور بگاڑ سے پاک کرنا۔ غایۃ الاوطار میں یہاں تک مذکور ہے کہ "حدود میں اکثر معاملہ اہلِ اسلام سے ہے اور جہاد میں کفار سے۔ تو معاملہ اہلِ اسلام کا اولیٰ بالتقدیم ہُوا"[۱] اس موقع پر یاد رکھیے امام ابوحنیفہ کا وہ فتویٰ کہ کفار کے خلاف جنگ کرنے سے زیادہ افضل اسلامی معاشرہ کی داخلی اصلاح ہے۔ پھر حدود میں ازالہ فسق ہے اور جہاد میں ازالہ کفر۔ ان دونوں چیزوں کو جہاد کی یہ تعریف اپنے اندر جمع کرلیتی ہے کہ "بذل، وسعت اور کوشش کرنا خدا کی راہ میں اور یہ شامل ہے ہر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کوشش کو"۔[۲] پھر ذرا یہ بھی پیش نظر رہے کہ جہاد کا ہدف تین قسم کے عناصر ہیں: اہلِ حرب، اہلِ ارتداد اور اہلِ بغاوت۔ پہلے دو عناصر یعنی دارالاسلام کے خلاف جارحانہ جنگ کرنے والوں اور مرتد ہونے والوں کا معاملہ تو واضح ہے۔ تیسرے عنصر کے متعلق حنفی قانون کے احکام بڑی بھاری سیاسی اہمیت رکھتے ہیں۔ باب البغاۃ کا موضوع ہے "حکم قتال مسلمین بغاوت شعار"۔[۳] فتح القدیر میں ہے کہ "شرعاً یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو امام حق کی طاعت سے بغیر حق کے نکل جائیں" لیکن اگر وہ برسرِ حق ہوں تو وہ باغیوں کی تعریف میں نہیں آتے۔ (فلو بحق فلیسوا ببغاۃ) جیسا کہ جامع الفصولین میں ہے۔ اسی بات کو یوں بھی بیان کیا گیا ہے کہ "اگر یہ خروج امام کے ظلم کے سبب سے ہُوا تو یہ لوگ باغی نہیں"۔[۴] کتنا اہم قانونی نکتہ ہے کہ اگر کچھ لوگ حکومت کے ظلم کے خلاف اصولِ حق پر اٹھ کھڑے ہوں تو وہ باغی نہیں ہیں۔ یہاں امام اعظم کا سیاسی نظریہ نمایاں ہے۔

اور پھر بحث چھڑ جاتی ہے نفس فرماں روا (امام) کی اور اس میں بھی سیاسی تصورات حل شدہ ہیں۔ حنفی قانون کے لحاظ سے ایک شخص کو دو چیزیں عملاً (De facto) فرماں روا بنا دیتی ہیں: ایک ہے اشراف و اعیان کی بیعت، دوسری اس کے قہر و جبروت کے خوف کی وجہ سے عملاً اس کے حکم کا جاری ہوجانا۔ اگر بیعت ہو مگر سکہ جاری نہ ہوسکے تو بے نتیجہ ہے۔ اگر اس کا سکہ جبر و قہر کے ذریعے چل جائے تو اس کے ظلم کرنے کے باوجود کسی بے اختیار عنصر کا اس کی معزولی کا فیصلہ دینا غیر مؤثر رہے گا اور عالم واقعہ میں اسی کی

۱۔ غایۃ الاوطار۔ ج ۲، کتاب الجہاد۔ (تمہید) ص ۴۶۶۔ ۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً۔ ج ۲، ص ۵۲۹۔ ۴۔ ایضاً

حکومت چلے گی۔ ہاں معزولی کا اقدام اس صورت میں مفید ہے جبکہ وہ قابو یافتہ نہ ہو۔ یا کمزور ہو۔ صورت اوّل میں اس کے ظالم حکمران ہونے کے باوجود اسے گوارا کرنا پڑے گا۔ اور اس کی حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اس کے ساتھ تعاون بھی کرنا ہوگا۔ تاکہ نظم و امن (Law & Order) قائم رہے خواہ کسی ادنیٰ شکل میں ہو۔[51] اس قانون میں اگرچہ حفاظتِ نظم کی خاطر عملاً De facto مسلط ہو جانے والے ظالم حکمران کو اضطراراً گوارا کرنے کا راستہ اختیار کیا گیا ہے۔ مگر اس کے پسِ منظر میں یہ تلقین موجود ہے کہ اگر اسے معزول کرنے کی قدرت ہو یا ایسی مؤثر قدرت پیدا کی جا سکے تو ہے وہ اسی قابل کہ اسے معزول کر دیا جائے۔ اسی بنا پر جہاد کا اقدام کرنے کے لئے ایک شرطِ لازم حنفی مدرسۂ فکر نے کتاب و سنت سے یہ اخذ کی ہے کہ اس سے غلبۂ اسلام متوقع ہو۔ اگر ایسا متوقع نہ ہو تو ناکافی اور غیر مؤثر قوت کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہونا جائز نہیں۔

جہاد کی بحث میں ایک دلچسپ نکتہ اور ہے۔ سراجیہ کے قول کے مطابق جہاد میں شرکت سے وہ عالم مستثنیٰ ہے جس سے افضل فقیہ آبادی میں موجود نہ ہو۔ کیونکہ وہ اگر آبادی سے چلا جائے گا۔ تو لوگوں کو ضائع کر دے گا۔[52] یعنی تعلیم و تعلّم اور فکری قیادت کو پا برجا رہنا چاہئے۔ اس نکتہ کی روشنی میں شاید یہ سمجھنا آسان ہوگا کہ امام ابو حنیفہؒ مسلح انقلابی تحریکوں کے رونما ہونے اور ان کے لئے جذبۂ حمایت رکھنے کے باوجود کوفہ میں جم کر کیوں بیٹھے رہے۔

ایک اور قیمتی بات سامنے آئی۔ حنفی قانون کے رُو سے مسلم اسیر (بدست کفار) کا چھڑانا مشرق و مغرب کے تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ بزازیہ میں ہے کہ اگر ایک مسلمان عورت بھی گرفتار ہو گئی ہو تو اہلِ مشرق و مغرب پر اسے رہا کرانا واجب ہے۔ اور طحاوی کا قول ہے کہ پورا دارالاسلام مکانِ واحد کے حکم میں ہے۔ یہاں گویا وحدتِ ملّتِ اسلامیہ اور وحدتِ عالمِ اسلامی کا نظریہ قانون کے پیرائے میں جلوہ گر ہے۔[53]

جہاد کے متعلقہ مسائل میں خود دارالاسلام اور دارالحرب کی بحث بڑی اہم ہے۔ خصوصاً یہ دارالحرب کب دارالاسلام بن جاتا ہے۔ اور دارالاسلام کیسے دارالحرب قرار پاتا ہے۔ استروشنی نے فصول میں ابوالیسر

---

[51] ایضاً ص ۵۳۰

[52] ایضاً۔ کتاب الجہاد۔ ص ۴۶۹

[53] ایضاً۔ ص ۴۷۰۔

کے حوالے سے ذکر کیا ہے کہ دارالاسلام دارالحرب نہیں ہوتا جب تک وہ سب امور باطل نہ ہو جائیں جن کے باعث وہ دارالاسلام بنا ہے۔ یہی بات مبسوط میں بھی آئی ہے۔ اور دارالاسلام بنانے والی چیز کیا ہے؟ اس کا جواب منشور میں امام ناظر الدین نے یہ دیا ہے کہ "دارالاسلام بہ سبب جاری ہونے احکام اسلام کے دارالاسلام ہوا ہے"۔ یہی بات ہم اپنی زبان میں کہیں تو یوں کہیں گے کہ اسلامی ریاست یا مملکت وہ ہے جس میں نظام اسلامی کارفرما ہو۔ گویا حنفی قانون میں یہاں ایک بنیادی نظریۂ سیاسی شامل ہے جو مسلمانوں کو یہ درس دیتا ہے کہ وہ جہاں ہوں (خصوصاً جبکہ آبادی بھی ان کی زیادہ ہو اور فرماں روا بھی مسلمان ہوں) نظام اسلام کو قائم کرنے اور احکام اسلامی کو جاری کرانے کی سعی کریں۔ تاکہ ان کی مملکت صحیح معنوں میں دارالاسلام قرار پائے۔ عملاً پیش آنے والے حالات کو ملحوظ رکھ کر حنفی فقہاء نے کسی اسلامی حکومت اور اسلامی معاشرہ کے لئے آخری حدِ معیار یہ رکھی ہے کہ اقامتِ عبادات (جمعہ وعیدین) اخذِ خراج اور تقلید قضاۃ کا سلسلہ جاری رہے[۱]۔

اب ہم اس گفتگو کو ختم کرنے سے پہلے صرف ایک بحث اور لیں گے جو "ادب القاضی" کے عنوان سے قانون کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس باب میں پورا ضابطۂ کارروائی (Procedure Code) بیان ہونے کے ساتھ عدلیہ اور منصب قضا کے متعلق بعض اصولیات مذکور ہیں۔ ان چیزوں کے مطالعہ سے اسلام کے دو بڑے تقاضے "آزادئ عدلیہ" اور "مساواتِ عدل" نمایاں ہو جاتے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ چیزیں دستوریات کے دائرے میں آتی ہیں۔ چند اشارات عرض ہیں۔

منصب قضا قبول کرنا کسی ایسے شخص کے لئے جائز نہیں ہے جو قبول کرنے کے بعد صحیح فیصلے دینے میں اپنے آپ کو بے بس محسوس کرے اور اپنے نفس کو دباؤ کے مقابلے میں قائم نہ رکھ سکے۔ اس لئے مناسب یہ ہے کہ حدیث کے مطابق قضا کے عہدہ کے لئے خود کبھی درخواست نہ کرے۔ ورنہ اس کی کور دبی رہے گی[۲]۔ سلطان جائر کی طرف سے قضاء کی ذمہ داری قبول کرنا اسی طرح جائز ہے جیسے سلطان عادل سے (کیونکہ

---

[۱] غایۃ الاوطار۔ ج ۲۔ ص ۴۹۳

[۲] ہدایہ (مذکورہ ایڈیشن) ج ۲۔ کتاب ادب القاضی۔ ص ۸۵۔

بعض صحابہ ـــ ابوالدرداء و فضالہ بن عبید انصاری ـــ نے دَورِ معاویہ میں قضا قبول کی، مگر یہ اس صورت میں جائز نہیں ہے جبکہ حکومت قاضی کو حق کے مطابق فیصلہ کرنے کے اختیار سے آراستہ نہ کردے۔ اس شرط نے بات واضح کردی۔ آزادیٔ قضا اور آزادیٔ عدلیہ اصل مطلوب ہے۔

اس آزادیٔ عدلیہ کے تحفظ کے لئے اسلامی قانون کا تقاضا یہ ہے کہ "و یجلس للحکم جلوساً ظاھراً" قاضی فیصلہ کرنے کیلئے کھلے اجلاس میں بیٹھے۔ ہدایہ نے "جلوساً ظاھراً فی المسجد" کے الفاظ لکھے ہیں۔ بلکہ ہوسکے تو جامع مسجد ہو۔ کیونکہ وہ زیادہ مشہور مقام ہے۔ لوگوں کو آسانی ہوگی۔ اس سے بھی بڑھ کر ایک بڑی قیمتی بات مسجد میں اجلاس کرنے کی دلیل کے طور پر کہی گئی ہے کہ قضاء عبادت ہے۔ اور اس کو قائم کرنا نماز کی طرح مسجد میں جائز ہے۔ گھر یا کسی دوسرے مکان میں بھی اجلاس کیا جاسکتا ہے۔ مگر لازم ہے کہ وہ لوگوں کو وہاں آنے کی عام اجازت دے۔ اس طرح قاضی تہمت سے بچ سکتا ہے[۱]

مساواتِ عدل کو قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ قاضی ہدیہ، رشوت اور دعوت قبول کرنے سے اجتناب کرے۔ (بجز بعض استثنائی صورتوں کے) ورنہ لوگ اثر انداز ہونے لگتے ہیں۔ اگر کوئی رشوت دیکر منصبِ قضا حاصل کرے، یا کسی فریق مقدمہ یا اس کے کسی آدمی سے وہ رشوت قبول کرے یا اس کے عملہ کے افراد اس کے علم کے ساتھ قبول کریں تو اس رشوت کے اثر کے تحت اسکے دیئے ہوئے فیصلے باطل ہوں گے۔ یعنی اگر اس کے خلاف استغاثہ بالائی عدالت میں لے جایا جائے اور رشوت کا الزام ثابت ہوجائے تو بالائی قاضی اس کے فیصلے کو مسترد کردیگا[۲] قاضی کے لئے یہ بھی لازم ہے کہ جب فریقین اس کے سامنے آئیں تو ان کو بٹھلانے اور ان کی طرف توجہ کرنے میں برابری قائم رکھے۔ ان میں سے کسی ایک سے سرگوشی نہ کرے۔ سر یا آنکھ سے اشارہ نہ کرے۔ اور حجت و استدلال کے لئے کوئی رہنمائی نہ دے۔ نہ کسی ایک کی طرف دیکھ کر بطورِ خاص ہنسے۔ ان دونوں کو یا ان میں سے کسی ایک کو ڈانٹے ڈپٹے نہیں۔ اور نہ کسی گواہ کو تلقین کرے[۳] "تسویت بین الخصمین فی الجلوس" کا یہ فیصلہ عام ہے، کبیر اور صغیر کے لئے، بادشاہ اور رعیت کے لئے، رذیل

---

[۱] ایضاً ص ۸۶۔
[۲] غایۃ الاوطار۔ ج ۳۔ ص ۲۱۲۔
[۳] ہدایہ (مذکورہ ایڈیشن) جلد ۲، ص ۸۶، ۸۷۔

اور شریف کے لئے، باپ اور بیٹے کے لئے اور مسلم اور ذمی کے لئے[۵۱]۔

ایک اصولی بات اور سنئے! "جب حاکم کا حکم قاضی تک لایا جائے تو وہ اسے نافذ کر دے۔ سوائے اس صورت کے کہ وہ حکم کتاب، سنت اور اجماع کے خلاف ہو اور ایسا قول ہو جس پہ کوئی دلیل نہ ہو۔"[۵۲] گویا فقہ حنفی کی رو سے حاکم کا فرمان شریعت کے تحت ہے۔ اور بادشاہ یا کوئی عہدہ دار قانون سے بالاتر نہیں۔

پس حنفی نقطہ نظر کے مطابق (جس سے کوئی بڑا اصولی اختلاف دوسرے مدارس فقہ میں نہیں پایا جاتا)۔ اسلام قانون کی عملداری (Rule of Law) کا نظام رکھتا ہے جو آزادئ عدلیہ اور مساوات عدل کے اصولوں پر قائم ہے۔

قانون کی کتابیں بڑے بڑے مجلدات پر مشتمل ہیں اور ان میں زندگی کے بے شمار اور قسم قسم کے مسائل پر بڑی مفصل بحثیں ہیں۔ اور ہر بحث میں بیش قیمت نکات پھیلے ہوئے ہیں۔ اس مقالہ میں ایک ضمنی موضوع پر ہم زیادہ آگے نہیں جا سکتے۔ اوپر کی مثالوں سے ہم نے صرف یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ نے ہمیں ایک مدون قانون ہی نہیں دیا بلکہ اس قانون میں حل کر کے اپنے سیاسی نظریات و تصورات بھی دئے ہیں۔ ان تصورات کو اپنے دور کے لوگوں تک اور بعد کی نسلوں تک منتقل کرنے کے لئے انہوں نے قانون کو واسطہ بنا کر بڑی بالغ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ قانون ـــــ خصوصاً مدون قانون ـــــ کی ضرورت اس وقت بھی تھی اور بعد میں بھی برقرار رہنی تھی۔ اور اس دائرے میں کئے ہوئے کام سے چار و ناچار ہر کسی کو استفادہ کرنا تھا اس لئے امام نے اگر اپنی سیاسی حکمت اور اپنے انقلابی پیغام کو کتابِ قانون کے بین السطور میں رکھ دیا تو یہ بہترین صورت تھی اسے زندہ رکھنے کی۔ آئیڈیالوجی کے تحفظ اور فروغ کا اس سے بہتر کیا ذریعہ ہو سکتا ہے کہ اسے زندگی سے تعلق رکھنے والے اہم ترین علوم میں سمو دیا جائے۔ اس مقصد کے لئے امام نے علمِ قانون کو پسند کیا۔ اور یہ انتخاب بہترین تھا۔ ان کے بالمقابل ابن المقفع نے ادبی نگارشات کے پسِ پردہ اپنے سیاسی احساسات کو پیش کرنے کا تجربہ کیا اور اخوان الصفا نے ادبی کہانیوں کے علاوہ

---

۵۲ غایۃ الاوطار۔ ج ۳، ص ۲۲۱۔

اس مقصد کے لئے بعض دوسرے علوم — جن کا تعلق جنرل نالج سے تھا — سے کام لیا۔ مگر وہ دونوں طرح کے تجربات دور رس اثرات کے حامل نہ ہو سکے۔ ان کا نسبتًہ کمزور سا اثر قریبی دور تک ہی رہ سکا۔ بخلاف ان کے امام کا کیا ہوا کام نہ صرف عباسی دور کے معاشرے میں اوپر سے لے کر نیچے تک چھا گیا۔ بلکہ بعد کی نسلوں میں صدیوں دور تک نفوذ کرتا ہوا آج بھی ایک زندہ طاقت ہے۔ البتہ بعد کے ادوار میں یہ ضرور ہوا کہ سلطنت اور معاشرہ کے حالات کو ملحوظ رکھ کر فقہاء نے امام کے اصول وفتاویٰ پر شروح اور حواشی لکھ لکھ کر فقہ حنفی کو زوال یافتہ ماحول کے لئے گوارا بنانے کی جو مخلصانہ سعی کی اس نے امام کے سیاسی نظریات کو دھندلا کر دیا اور ان کی انقلابیت کی کاٹ کو گھٹا دیا پھر بھی امام کے سیاسی نظریات کے تہ نشین موتیوں کو فقہ کے سمندر کی تہ سے برآمد کیا جا سکتا ہے۔ آج یہ موضوعِ کاوش مردانِ دیدہ ور کو پکار رہا ہے۔ (باقی)

نبوّت کی ضرورت

(۳)

عبدالحمید صدیقی

گذشتہ اشاعتوں میں ہم نے تصوّف، اُس کی ماہیّت اور اُس کی کمزوریوں پر بحث کی تھی۔ اور بتایا تھا، کہ انسان کی قلبی واردات اور داخلی کیفیات خواہ وہ کتنی ہی قیمتی اور قابل قدر ہوں اور انسان کے نہایت ہی اعلیٰ و ارفع احساسات کی ترجمان، لیکن اُن میں بہر حال یہ صلاحیت موجود نہیں کہ وہ انسان کی زندگی کے سارے شعبوں میں مکمّل رہنمائی دے سکیں۔ ان کیفیات سے انسان ایک روحانی کیف اور سرور تو بلاشبہ حاصل کرتا ہے لیکن انہیں انسان کی اجتماعی زندگی کی کبھی اساس نہیں بنایا جاسکتا۔ انسان کی خارجی زندگی میں یہ نفسی تجربات کچھ زیادہ مؤثر ثابت نہیں ہوتے، ان سے کسی تہذیب اور کسی تمدن کی تشکیل نہیں کی جاسکتی۔

انسان کی حیات اجتماعی اور اُس کے مسائل بھی چونکہ اس عالم کے نہایت ہی ٹھوس حقائق ہیں، جن سے انسان بحیثیت انسان صرفِ نظر نہیں کرسکتا۔ اس لئے تاریخ کے کسی دَور میں کسی قوم اور ملّت نے تصوّف کو اجتماعی ضابطۂ حیات کی حیثیت سے نہیں اپنایا اس نے انسانوں کے اندر ہمیشہ انفرادیت کی پرورش کی۔

متصوفین نے نوعِ انسانی کی جس انداز سے خدمت سرانجام دی اس میں اختلاف کی پوری گنجائش ہے۔ لیکن ان حضرات کے بارے میں ایک بات قدرے وثوق سے کہی جاسکتی ہے، کہ انہیں اپنی حدود کا پورا پورا احساس تھا اور انہوں نے اُن دائروں میں کبھی قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی جنہیں وہ تصوّف کی حدود سے خارج سمجھتے تھے۔ اُنہوں نے بڑے واشگاف الفاظ میں یہ کہا کہ اُن کا کام صرف اسی قدر ہے کہ حق کے طلبگاروں میں ذاتِ حق کا صحیح شعور و ادراک پیدا کریں اور انسان کے جو داعیات اس راہ میں مزاحم ہوں اُن سے انہیں نجات دلائیں۔ اس ایک دعویٰ کے علاوہ متصوفین نے کبھی کوئی اور دعویٰ نہیں کیا۔ اُنہوں نے اپنی

حدود کو پوری طرح ملحوظ خاطر رکھا۔

انسان کی رُشد و ہدایت کے لیے اب جو نئے دعویدار سائینس دانوں کی صورت میں نمودار ہوئے ہیں اُن کے دعاوی متصوفین کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہیں۔ اور وہ اپنی فطری حدود کو نظر انداز کر کے اُن رفعتوں تک پہنچنے کا داعیہ رکھتے ہیں جو فطرتاً اُن کے حدِ ادراک سے ماورا ہیں۔ غلط اندازِ فکر نے اُن کے اندر ایک قسم کی جسارت پیدا کر دی ہے اور وہ حقائق سے یکسر صرفِ نظر کرتے ہوئے انسان کی پوری زندگی کے لئے ہدایت و رہنمائی کے مدعی ہیں۔

ان صفحات میں ہم سائینس دانوں کے اس دعوی کے متعلق چند گذارشات پیش کریں گے۔ سائینس لاطینی زبان کے لفظ (SCINTIA) سے مشتق ہے جو لفظ علم کے ہم معنی ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اس لفظ کا علم کے ہر شعبہ میں اطلاق ہوتا تھا لیکن ہمارے اس دور میں سائینس سے مراد وہ مخصوص علم ہے جس کی بنیاد تجربہ اور مشاہدہ ہو اور جو عالم محسوسات کے حقائق کو علت و معلول کی کڑیوں میں اس انداز سے جوڑے کہ اُن سے نتائج بآسانی اخذ کئے جا سکیں۔ ایسے نتائج جن کی افادیت اور قدر و قیمت تجربہ کی میزان پر تول کر معلوم ہو جائے۔

انسان کے لئے صحیح ضابطہ حیات مہیا کرنے میں سائینس کی بیچارگی اور درماندگی پر بحث کرنے سے پیشتر یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ایک نظر اُن اسباب پر بھی ڈال لیں جنہوں نے سائینس کو دورِ جدید میں غیر معمولی اہمیت دی ہے۔

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے اس بات پر مجبور ہے کہ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے رنگا رنگ مظاہر کا نہ صرف مشاہدہ کرے بلکہ اُن کے درمیان ہم آہنگی بھی تلاش کرے ـــــ وہ جب تک اُن کے مابین ایک فطری ربط کا پتہ نہیں لگا لیتا اُس کا مشاہدہ فطرت ناتمام رہتا ہے جس طرح ایک متصوف گیان اور دھیان کی مدد سے ایک وقتی کیف اور سرور حاصل کرتا ہے اور اگر مذہب اُس کی معاونت اور دستگیری نہ کرے تو وہ اس عارضی سرور کی منزل سے گزر کر حقیقت کو پانے سے یکسر قاصر رہتا ہے بالکل اسی طرح اگر مشاہدہ کائنات کے پیچھے اُس حقیقت کبریٰ کی تلاش و جستجو کا جذبہ صادق کارفرما نہ ہو، جو اس نظام تکوینی کی فی الواقع علت غائی ہے تو وہ بھی اسی کائنات کے وسیع اور پیچیدہ طلسم میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے اور حقیقت تک

پہنچ نہیں پاتا۔

اسرارِ کائنات کے متعلق عقل و فکر کی یہ بے چینی جو آگے چل کر عقیدہ اور ایمان پر منتج ہوتی ہے اور جس کے سمجھنے سے انسان نہ صرف خالق کا ادراک کرتا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو بھی پہچاننے میں کامیاب ہوتا ہے انسانی فطرت کا سب سے اہم خاصہ ہے

لالہ و گل کہاں سے آئے ہیں ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے

یہ دورِ جدید کے انسان کے لئے ہی وجہ اضطراب نہیں بلکہ عہدِ ماضی کے انسانوں کے لئے بھی ایک راز تک جس پر سے پردہ اُٹھانے کے لئے اُن کا ذہن ہمیشہ بے تاب رہا۔ نظامِ تکوینی کو سمجھنے کے لئے دونوں ایک ہی طرح بے چین ہیں لیکن آج کے انسان اور ماضی کے انسان میں اس اتفاق و اتحاد کے باوجود ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ عہدِ ماضی کا انسان چونکہ اس کائنات کو کوئی اتفاقی حادثہ نہ سمجھتا تھا بلکہ وہ اسے ایک قادرِ مطلق اور مدبّر ذات کی تدبیر کی کرشمہ سازی خیال کرتا تھا۔ اس لئے وہ جب کبھی بھی کائنات کا مطالعہ کرتا تو وہ اس میں خالق کائنات کی حکمت اور دانائی کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا۔ اُس کا دل بیتاب کائنات کے خارجی مظاہر کے مشاہدہ پر مطمئن نہ ہوتا .... بلکہ وہ اس کائنات کے ظاہری پردوں کے پیچھے جھانک کر اُس حقیقتِ کبریٰ کو جاننے کی سعی کرتا جس کو جاننے اور ماننے بغیر خود اُس کا وجود ہستی کی وسعتوں میں بے معنی سا ہو کر رہ جاتا ہے۔ محدود و لامتناہی سے اُسے گوناگوں دلچسپی تھی اور وہ اس پر بار بار نگاہ ڈالتا۔ لیکن اُس کے فکر و نظر نے کبھی اسے اپنی پرواز کی آخری حد تسلیم نہ کیا۔ اس کی حیثیت اُس کے نزدیک ہمیشہ نشانِ منزل کی رہی اور یہ کائنات کبھی اُس کی منزلِ مقصود نہ بننے پائی۔ اُس نے گہرے اضطراب کے ساتھ اس محسوس اور محدود دنیا سے گزر کر اُس غیر محدود اور لامتناہی کو سمجھنے کے لئے جد و جہد کی جس میں وہ تمام اوصافِ عالیہ بدرجہ اتم موجود ہوں جنہیں وہ اپنی ذات میں پیدا کرنے کا آرزو مند ہے اور جس کی بدولت اُسے یقین و ایمان کی لافانی دولت ہاتھ آتی ہے۔ جو اس کی خودی کی ترقی کی ضامن ہے۔

قدیم انسان کے برعکس عہدِ حاضر کے انسان نے جس وقت مظاہرِ قدرت کا مطالعہ شروع کیا اُس وقت چونکہ اُس پر سے مذہب کی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اس لئے اُس کے دل میں غیر محدود کو سمجھنے کی لگن

بھی کا تی حد تک کم ہوگئی اور اس وجہ سے اُس کی نظر برق و بخارات کی حد تک سے آگے نہ بڑھنے پائی اُس کا ذہن اسی مادی دُنیا کے خم و پیچ ہی میں اُلجھ کر رہ گیا۔ اور اُس کے اندر کبھی یہ احساس نہ پیدا ہُوا کہ وہ اس طلسم ہوش رُبا کی گرفت سے نکل کر حقیقت کا ادراک کرے۔

قدیم اور جدید انسان کے درمیان فکر و نظر کے اس اساسی اختلاف کی وجہ سے سائنس کے بارے میں اُن کا طرز عمل ایک دوسرے سے بُنیادی طور پر مختلف رہا ہے۔ ماضی کی بے شمار قوموں، خصوصاً ملتِ اسلامیہ نے مظاہرِ کائنات کا بڑے گہرے جذبہ کے ساتھ مطالعہ اور مشاہدہ کیا۔ اور پھر اس مطالعہ کی مدد سے اُن قوتوں کو غلام بنایا جو انسان کی خدمت اور چاکری کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لیکن مظاہرِ قدرت کے ساتھ اس گہرے شغف کے باوجود اُنہوں نے کبھی بھی انہیں مقصود و مطلوب بنالینے کی حماقت نہ کی۔

مغربی انسان چونکہ ایمان جیسی نعمت سے محروم ہو چکا ہے اس لئے اُس نے اس مادی کائنات کو ہی منزلِ مقصود سمجھ کر اُس کے ساتھ عبودیّت کا تعلق استوار کر لیا ہے۔ فطرت کی یہ ساری رنگا رنگی، بہتے ہوئے دریا، لہلہاتا ہوا سبزہ، کوہ و صحرا، غنچہ و گُل، اور ماہ و انجم جدید انسان کے لئے معرفت کردگار کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک اندھے بہرے لزوم کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک اس کائنات میں کوئی منصوبہ اور نظم نہیں۔ یہاں کسی مدبّر کا ارادہ و تدبیر کارفرما نظر نہیں آتی۔ بلکہ اس کائنات میں جو کچھ موجود ہے وہ محض بخت و اتفاق سے طبیعی اور کیمیاوی قوتوں کے تعامل سے معرضِ وجود میں آگیا ہے۔

دنیا کا کوئی گروہ اگر نشانِ منزل کو ہی منزلِ مقصود سمجھ لے تو اُس سے زیادہ گم کردہ راہ اور کون ہو سکتا ہے۔ یہی حال آجکل اہلِ مغرب کا ہے۔ علوم طبیعی جن کا مقصد انسانی عقل و بصیرت کو اُس کی فطری حدود سے آگاہ کر کے اُسے کائنات کی سب سے بڑی حقیقت سے لذّت آشنا کرنا تھا، وہ خود معرفت حق کی راہ میں زبردست رکاوٹ ثابت ہو رہے ہیں۔......

...... اُنہوں نے بدقسمتی سے انسان کی فکری صلاحیتوں کو اس حد تک مفلوج کر دیا ہے کہ وہ حواس کی گرفت سے آزاد نہیں ہونے پاتیں اور اگر اُن کے اندر کبھی تحریک پیدا بھی ہوتی ہے تو وہ انہیں کے قفس میں پھڑپھڑا کر جان دے دیتی ہیں۔ اہلِ مغرب نے ان علوم کے گرد و پیش تعصب اور تنگ نظری کے

ایسے مضبوط حصار قائم کر رکھے ہیں۔ کہ جن سے نکلنا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہو گیا ہے۔

فکر و نظر کی اس کجی کی وجہ سے جدید انسان اُس توازن کو اپنے ہاتھ سے کھو بیٹھا ہے جو علوم طبیعی کے مطالعہ میں صاحب ایمان قوم نے ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا۔ انسان کے شعور و احساس سے جب ایک غیر محدود اور لامتناہی ذات سے محبت رخصت ہوئی تو پھر انسان نے اس مادی دنیا اور اس کی قوتوں پر اندھا دھند اعتماد کرنا شروع کیا۔ کسی بلند و بالا ہستی پر ایمان چونکہ انسان کا ایک فطری مطالبہ ہے۔ جس سے وہ کبھی صرف نظر نہیں کر سکتا۔ اُس کے دل میں جب کبھی بھی ایمان کا خلا پیدا ہو گا تو وہ اس خلا کو جلد از جلد کسی دوسری ذات یا قوت کے ساتھ غیر معمولی عقیدت کا رشتہ اُستوار کر کے پُر کرنے کی کوشش کرے گا۔ انسان جس طرح خلا میں چند لمحوں کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا اور وہ اس کمی کو فوراً مصنوعی طریقوں سے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے بالکل اسی طرح وہ ایمان کے بغیر چند لمحات بھی گذارنے کی ہمت و طاقت نہیں رکھتا اور فکر و احساس کے خلا کو مظاہر قدرت اور توانائی پر اعتماد کر کے پُر کرتا ہے۔ ایمان اُس کی طبیعت کا بنیادی تقاضا ہے وہ اس تقاضے کو اگر چاہے تو کائنات کی سب سے واضح اور سب سے بڑی حقیقت پر ایمان لا کر پورا کرے اور چاہے تو اس کارخانہ قدرت کے کسی کل پُرزے کو ہی اپنا معبود سمجھ بیٹھے۔ معبود مانے بغیر کوئی چارہ نہیں۔

چنانچہ جدید انسان نے خدائے برتر کی غلامی کا جُوا تو اپنے کندھوں سے اُتار پھینکا ہے اور اُس کی جگہ علوم طبیعی کی محبت اور عقیدت میں اپنے آپ کو گرفتار کر لیا ہے۔ اب یہی علوم اُس کے فکر کی آخری پرواز ہیں۔ ان سے ماوراء اسے کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اُس کا اب اس بات پر پختہ یقین ہو چکا ہے کہ دُنیا میں جو کچھ موجود ہے وہ مادہ ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ کائنات اپنے وجود کے لئے اسی کی رہینِ منت ہے۔ قلب و ضمیر، فکر و احساس سب اسی کی ترقی یافتہ صورتیں ہیں۔

کائنات اور خالق کائنات کے متعلق یہ غیر حقیقت پسندانہ طرز فکر یورپ کے اندر یونہی پیدا نہیں ہو گیا۔ اس کے پیچھے بعض اسباب کام کر رہے تھے۔ ان میں ایک بڑا سبب مسیحیت کی ناکامی اور مسیحی علماء کی تنگ نظری اور تعصب تھا۔ دُنیائے مغرب میں جب نشاۃ ثانیہ کی تحریک شروع ہوئی

او وہاں کے رہنے والوں نے فکر واحساس کی انگڑائی لی تو انہیں پہلے قدم پر جس گروہ سے سابقہ پیش آیا وہ تنگ نظر پادریوں کا گروہ تھا۔ اس گروہ نے اس تحریک کا نہایت غلط انداز سے راستہ روکنا چاہا، اور ظلم واستبداد کے ذریعہ اس تحریک کے علمبرداروں کچلنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ چِڑ اور ضد میں آکر ان لوگوں نے مذہب کے خلاف ہی بغاوت کر دی۔ اُنہوں نے کائنات کی بدیہی شہادتوں کے باوجود زندگی کی ساری عمارت کو الحاد کی بنیادوں پر استوار کیا۔ اور بڑے زور کے ساتھ اس امر کا اعلان کیا کہ اس مادی کائنات کے سوا دنیا میں کوئی چیز نہیں۔ اس کے پیچھے کسی مدبّر کی تدبیر کام نہیں کر رہی۔ یہاں کسی بلند و بالا ذات کا ارادہ کارفرما نہیں۔ اس کائنات کا کوئی خالق اور مالک نہیں، انسان کسی آسمانی ہدایت کا محتاج نہیں۔ اور یہاں کوئی واجب الاطاعت نظام اخلاق نہیں۔ یہ تھا وہ اندازِ فکر جس کے مطابق یورپ کا رُخ ایک مکمل اور وسیع مادیت کی طرف پھر گیا۔ خیالات، نقطۂ نظر، نفسیات و ذہنیت، اخلاق و اجتماع، علم و ادب، حکومت و سیاست، غرض زندگی کے تمام شعبوں میں الحاد پوری طرح غالب آگیا۔ اگرچہ یہ سب کچھ تدریجی طور پر ہُوا اور ابتداء میں تو اس کی رفتار بہت سست تھی لیکن آہستہ آہستہ اس طوفان نے سارے یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

سائنس دان ان علوم طبیعی کے بارے میں جو بلند بانگ دعاوی چاہیں کرتے رہے لیکن یہ حقیقت اب واضح ہو کر سامنے آچکی ہے کہ سائنس انسان کے لئے صحیح ضابطہ حیات فراہم کرنا تو ایک طرف خود محسوسات اور مشاہدات کی دنیا کے بہت سے مسائل حل کرنے سے عاجز ہے۔ مثال کے طور پر وہ ابھی تک اس اُلجھن کو سلجھانے سے قاصر ہے کہ اگر اس کائنات کو غیر معین توانائی کا نتیجہ مان لیا جائے تو پھر اس کے بطن سے معین مظاہر کیسے پیدا ہو گئے۔ یہ تنوع، کثرت و تعدد کیا ہیں۔ اگر یہ سب کارخانہ بے مقصد ہے تو پھر بے منصوبہ عمل سے نظم و ربط کیسے ظاہر ہو گئے۔ ارتقاء کے میکانکی لزوم نے شعور و آگہی کو کیونکر جنم دیا؟ پھر خود شعور اس توانائی سے کیونکر مختلف ہو گیا جس سے وہ کہا جاتا ہے کہ وہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ اس وقت یہ موضوع ہمارے پیش نظر نہیں اس لئے ہم اسے نظر انداز کر کے اصل مقصد کی طرف بڑھتے ہیں۔

انسان خواہ کسی عہد اور ملک کا ہو، اُس کا تعلق کسی طرزِ فکر سے ہو، وہ خدا پرست ہو یا توہم پرست آتش پرست ہو یا بتوں کا پجاری، خالق کو ماننے والا ہو یا اس کے وجود سے انکار کرنے والا، اُس کے اندر بعض فطری سوالات کو سمجھنے کی لگن بہرحال موجود رہتی ہے۔ مثلاً اُس کا دل بے تاب اس امر کو جاننے کی ہمیشہ کوشش کرتا ہے اس عالم رنگ و بو کا آغاز کیا ہے اور اس کا آخری انجام کیا ہوگا۔ اس کارخانہ قدرت میں اس کی حیثیت کیا ہے اور اُسے کس مقصد کی تکمیل کی خاطر معرضِ وجود میں لایا گیا ہے۔ اس کائنات کے خالق خواہ وہ مادہ ہی ہو، اُس سے اُس کے تعلق کی کیا نوعیت ہونی چاہیئے؟ انسان جب تک وہ انسان ہے فطرتِ انسانی کے ان بنیادی سوالات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ یہ ہمیشہ اُس کے لئے وجہ اضطراب رہے ہیں۔ اور جب تک اُس کے جسم و جان کا رشتہ منقطع نہیں ہوتا اُس کے قلب و دماغ میں ہمیشہ تحریک پیدا کرتے رہیں گے۔ ان سوالات کی نوعیت کوئی ذہنی ریاضت یا بازیگری کی نہیں بلکہ یہ فطرتِ انسانی کی اتھاہ گہرائیوں سے اُبھرتے ہیں، اور انسان سے ہر لمحہ اس امر کا مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا حل تلاش کرے۔ کیونکہ ان کا حل ڈھونڈنے سے ہی انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا رُخ متعین ہوتا ہے اور علم و فلسفہ، تہذیب و شائستگی، معاشرت و معاملات، اخلاق و اجتماع، سیاست و آئین کی ایک خاص نہج پر تشکیل ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی کا کوئی دور ایسا نہیں گزرا جس میں ان سوالات نے انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے اُن سے ان کے جوابات کا تقاضا نہیں کیا۔ پھر ان جوابات پر ہی مختلف انسانی فلسفے، تہذیبیں اور نظام ہائے حیات قائم ہوئے۔

ایک تہذیب کے مختلف مظاہر کے درمیان جو ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ بھی انسانی فطرت کے ان اساسی مطالبات کے بارے میں ایک خاص اندازِ فکر اختیار کرنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کے جوابات دینے میں ایک خاص نقطہ نظر اختیار کریں گے تو یہ نقطہ نظر زندگی کے سارے گوشوں میں پوری آب و تاب سے نمایاں ہوگا۔ اور فکر و نظر کا یہ اتفاق و اتحاد ہی کسی تہذیب کے مختلف شعبوں کو ایک خاص رنگ میں رنگ کر اُن کے اندر وحدت پیدا کرے گا۔

آپ اسلامی تہذیب کو لیجیئے اور دیکھئے کہ اس کے مختلف مظاہر کے اندر کتنی ہم آہنگی پائی جاتی

ہے۔ اس ہم آہنگی کی وجہ صرف یہی ہے کہ مسلمان خواہ کسی دور سے تعلق رکھتا ہو اُس نے انسان کے ان فطری سوالات کے جوابات دینے میں ایک خاص نہج اور انداز اختیار کیا ہے۔ اس کائنات کے آغاز و انجام کے متعلق اُس کا جواب یہ ہے کہ یہ کائنات کسی اتفاقی حادثہ کا نتیجہ نہیں۔ بلکہ ایک قادرِ مطلق ذات کی تدبیر کی کرشمہ سازی ہے۔ وہی ذات اس کائنات اور جو کچھ اس میں موجود ہے اس کی تنہا خالق و مالک ہے اور کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک وسہیم نہیں ہو سکتا۔ اسی ذات نے اسے پوری حکمت و دانائی کے ساتھ وجود بخشا ہے۔ اور وہی ذات اپنے ارادہ و مشیّت کے تحت اُسے نیست و نابود کریگی۔ یہاں جو کچھ موجود ہے وہ اپنے بقا، نشو و نما کے لئے صرف اُسی قادرِ مطلق ذات کا رہینِ منت ہے۔ پوری کائنات میں صرف اُسی کا ارادہ کار فرما ہے۔ اور وہ با اختیار ہستی اس کائنات کو پیدا کر کے اس کی طرف سے غافل نہیں ہو گئی بلکہ اس کا ہر ذرہ اُس کی نگاہ اور اختیار میں ہے۔ فکر و احساس، ارادہ و نیّت جیسی لطیف اور غیر مرئی لہروں سے لیکر بڑے سے بڑے سیاروں تک سب پر اُس کا بلا شرکتِ غیرے تسلّط و اقتدار قائم ہے۔ کسی کے اندر یہ ہمّت و طاقت نہیں کہ وہ اس کے حکم سے سرمو بھی انحراف کر سکے۔

جہاں تک اس کائنات میں انسان کی حیثیت کا تعلق ہے اُس کے متعلق ایک مسلمان کے دل و دماغ میں یہ بات راسخ کی گئی ہے وہ اگرچہ مخلوق کی دوسری چیزوں کے مقابلے میں ممتاز ہے۔ لیکن اپنے خالق کے مقابلے میں وہ ایک عاجز اور بے بس بندہ ہے۔ جو اپنی زندگی، اور اپنی ساری جسمانی قوتوں، اور فکری صلاحیتوں کے لئے اُسی قادرِ مطلق کا محتاج ہے جس کی یہ ساری کائنات دست نگر ہے۔ اُسے اگر ایک دائرہ عمل میں محدود اختیار سونپا گیا ہے تو یہ بھی اُسی خالق کی کریم فرمائی ہے تاکہ وہ اپنے ارادہ و اختیار سے اپنے معبود کے حضور میں اپنی عبودیت ثابت کر سکے۔ اور یہی وہ مقصد ہے جس کی تکمیل کے لئے اُسے پیدا کیا گیا ہے

فطرت کے بنیادی سوالات کے ان جوابات سے ہی وہ اساسی نقطہ نظر سامنے آتا ہے جس پر اسلامی تہذیب و تمدّن کی عظیم الشان عمارت قائم ہوئی ہے اور اُس کے مختلف حصّوں کے درمیان ایک ربط و نظم ظاہر ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ اس تہذیب کا کوئی گوشہ اسلامی بھی کہلائے اور وہ اس نقطۂ نظر کے رُخِ زیبا کا عکس نہ ہو۔ (باقی)

رسائل و مسائل

یہود کی ذلّت و مسکنت

سوال - میرے ذہن میں دو سوال بار بار اُٹھتے ہیں۔ ایک یہ کہ ضُرِبَتْ علیھم الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ جو یہود کے بارے میں نازل ہوا ہے اس کا مفہوم کیا ہے۔ اگر اس کا مطلب وہی ہے جو معروف ہے تو فلسطین میں یہود کی سلطنت کے کیا معنی۔ میری سمجھ میں اس کی تفسیر انشراحی کیفیت کے ساتھ نہ آسکی۔ اگر اس کے معنی یہ لیے جائیں کہ نزول قرآن پاک کے زمانے میں یہود ایسے ہی تھے تو پھر مفسرین نے دائمی ذلت و مسکنت میں کیوں بحثیں فرمائی ہیں۔ بہرحال یہود کے موجودہ اقتدار و تسلط کو دیکھ کر ذلّت و مسکنت کا واضح مفہوم سمجھ میں نہیں آیا۔

جواب - ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ کے بارے میں میرا بھی یہی عقیدہ ہے کہ یہ تا قیامت ہے۔ اس میں فلسطین کی موجودہ اسرائیلی حکومت بن جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اوّل تو آیت تمام یہودی ملّت کے بارے میں بحیثیت مجموعی ایک حکم لگاتی ہے، اس کے ایک ایک فرد پر یا افراد کے چھوٹے چھوٹے مجموعوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ اُس کیفیّت کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ صادر ہونے کے بعد سے قیامت تک ان پر من حیث المجموع دنیا بھر میں طاری رہے گی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس طویل مدّت کے دوران میں کبھی کسی مختصر مدّت کے لیے بھی زمین کے کسی گوشے میں انہیں قوت و اقتدار نصیب نہ ہو۔ دراصل اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہودی قوم کی اس تاریخ سے واقف ہونا ضروری ہے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد سے آج تک گزری ہے۔ اس تاریخ کو، اور ان کی موجودہ حالت کو جو بحیثیت مجموعی دنیا میں آج بھی پائی جاتی ہے، بغور دیکھا جائے تو قرآن مجید کے

ان ارشادات کی پوری تصدیق ہو جاتی ہے:

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ يَّسُوْمُهُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ (الاعراف۔ ۱۶۷)

اور جب اعلان کر دیا تیرے رب نے کہ وہ قیامت تک ان پر کسی نہ کسی ایسے شخص کو مسلط کرتا رہیگا جو ان کو سخت عذاب دے گا۔

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ۔ (آل عمران۔ ۱۱۲)

ان پر ذلت تھوپ دی گئی جہاں بھی وہ پائے جائیں بجز اس کے کہ کہیں ان کو اللہ کی طرف سے اور انسانوں کیطرف سے تحفظ کی ضمانت مل جائے۔

پوری تاریخ یہی بتاتی ہے کہ وقتاً فوقتاً دُنیا کے کسی گوشے میں کوئی نہ کوئی طاقت ایسی اُٹھتی رہی ہے جو یہودیوں کو خوب مارتی کھدیڑتی رہی۔ اور جہاں کہیں بھی وہ بخیریت رہے ہیں اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ اللہ کے دیئے ہوئے مواقع کی بنا پر کسی دوسرے ہی انسانی گروہ کی حمایت میں آجانے کی وجہ سے رہے ہیں۔ موجودہ یہودی ریاست بھی برطانیہ اور امریکہ کی حمایت ہی میں قائم ہوئی ہے اور باقی ہے۔ یہ حمایت جس وقت بھی ہٹے گی اس ریاست کا حشر دنیا دیکھ لے گی۔ میرا خیال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس قوم کو فنا نہیں کرنا چاہتا بلکہ نمونۂ عبرت بنا کر باقی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر اس پر مسلسل عذاب کا کوڑا ہی برستا رہتا تو یہ کبھی کی فنا ہو چکی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے اس کے باقی رہنے کا یہ انتظام کر دیا ہے کہ کہیں وہ پٹتی جاتی ہے تو کہیں اسے پناہ بھی مل جاتی ہے۔ اس طرح یہ ڈھائی ہزار برس سے لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى کے مصداق اس دُنیا میں جیے جا رہی ہے۔

کیا اسلام دینِ فطرت ہے؟

سوال: دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی دینِ فطرت ہے اور ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں تو پھر کیوں دُنیا کی اکثریت اس سے برگشتہ ہے اور اس کے اپنے بھی اس پر مطمئن نہیں۔ کیا اس کے مقدر میں ابھرنا لکھا ہی نہیں۔ صرف اوّل و آخر ابھر کر درمیانی طبقات میں خاموش رہنا ہے۔

جو تحریک بھی اسلام کے نام پر اُٹھتی ہے کچھ دن بعد اس کا رشتہ طاغوت سے جا ملتا ہے، اِلّاَ مَا شَاءَ اللّٰہ۔ آخر یہ کیوں ؟

جواب۔ اسلام واقعی دینِ فطرت ہے۔ دنیا کی اکثریت کا اس سے برگشتہ ہونا اس کے دینِ فطرت ہونے میں اگر قادح ہو سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ یہ ثابت ہو جائے کہ دنیا کی اکثریت ہمیشہ فطرت کے مطابق زندگی بسر کرتی رہی ہے اور آج کر رہی ہے۔ انسان کے حالات کا جائزہ لے کر آپ بیک نظر معلوم کر سکتے ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے جو اختیارات اس کی طرف منتقل فرمائے ہیں ان کو اقلیت نے تو فطرت کے مطابق استعمال کیا ہے مگر اکثریت انہیں فطرت سے ہٹنے ہی میں استعمال کرتی رہی ہے۔ مثلاً حفظانِ صحت کے اصول بالکل فطری ہیں۔ مگر انسانوں کی اکثریت دانستہ ان کی خلاف ورزی کیے چلی جاتی ہے، حالانکہ بے اختیار حیوانات کبھی ایسا نہیں کرتے۔ لہٰذا انسانوں کی اکثریت کا برگشتہ ہونا اسلام کے دینِ فطرت ہونے کے خلاف دلیل نہیں بن سکتا۔

ڈاڑھی پر مسلمانوں کے اعتراضات

سوال۔ ڈاڑھی کے بارے میں اکثر مسلمانوں کے سوچنے کا انداز یہ ہے کہ ڈاڑھی صرف علماء اور مولانا حضرات کو زیب دیتی ہے۔ نبی اکرم کے زمانے میں عام طور پر ڈاڑھی رکھی جاتی تھی اس لیے اکثریت ڈاڑھی رکھنے میں عادتہ سمجھتی تھی۔ مگر اب انسان کے لباس و آراستگی میں کافی فرق واقع ہو چکا ہے۔ چہرے بغیر ڈاڑھی کے پُر رونق و بارعب نظر آتے ہیں۔ کیا ایسے حالات میں ہر مسلمان کے لیے ڈاڑھی رکھنا لازم ہے؟ براہِ کرم اس معاملے میں ذہن کو یکسو و مطمئن فرمائیں۔

جواب۔ ڈاڑھی رکھنا نہ صرف یہ کہ فعلی سنت ہے بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے رکھنے کا حکم دیا ہے اور مونڈنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے یہ سمجھنا کہ ڈاڑھی رکھنا صرف علماء اور مولانا حضرات کا کام ہے اور عام مسلمان مختار ہیں کہ چاہیں رکھیں یا نہ رکھیں، بالکل غیر اسلامی اور غلط طرزِ فکر ہے۔ خصوصاً اگر آدمی ڈاڑھی مونڈنے کو پسند اور رکھنے کو ناپسند کرتا ہے تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس کے

اندر اسلامی ذوق کے بجائے کافرانہ ذوق پرورش پا رہا ہے۔

یہ بڑی عجیب اور افسوسناک بات ہے کہ جس طرح مسلمانوں کو ان کے ہادی و رہبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی رکھنے کا حکم دیا اسی طرح سکھوں کو بھی ان کے پیشوا نے اس کا حکم دیا تھا، ہمارے ملک میں انگریزی حکومت کے تحت دونوں رہے اور مغربی تعلیم دونوں نے پائی، لیکن سکھوں نے اپنے پیشوا کے حکم کی وہ بے احترامی نہیں کی جو مسلمانوں نے کی۔ درحقیقت یہ ایک بدترین علامت ہے جس پر مسلمانوں کو شرم آنی چاہیے، کجا کہ وہ بلاتکلف ان خیالات کا اظہار کریں کہ داڑھی کے بغیر چہرے بارونق ہوتے ہیں اور ڈاڑھی رکھنے سے بے رونق ہو جاتے ہیں۔ آج فرنگیت زدہ مسلمان محض ڈاڑھی مونڈنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ڈاڑھی کو بُرا سمجھتے ہیں۔ اس کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ اس کے رکھنے والوں کی تذلیل و تضحیک کرتے ہیں۔ درس گاہوں میں ہر ممکن طریقے سے ان کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں اُنہوں نے بجائے خود ڈاڑھی کو نااہلی کا سرٹیفکیٹ قرار دے رکھا ہے۔ اور بعض ملازمتوں میں تو اس کے رکھنے پر پابندیاں تک عائد ہیں۔ ان لوگوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنے سے آدمی چست اور جامہ زیب (smart) نہیں رہتا۔ یہ سب کچھ ایک مسلم سوسائٹی اور مسلم ریاست میں ہو رہا ہے۔ لیکن سکھوں نے انگریزی حکومت کے زمانے میں اپنا یہ حق تسلیم کرا کے چھوڑا کہ وہ ڈاڑھی رکھ کر ہر شعبۂ حیات میں داخل ہو سکتے ہیں اور بڑے سے بڑے مناصب پر پہنچ سکتے ہیں۔ فوج، ایرفورس، نیوی، اور سول کے کس شعبے میں وہ نہیں پہنچے اور کونسا بڑے سے بڑا عہدہ ایسا رہ گیا جو محض ڈاڑھی رکھنے کی وجہ سے ان کو نہ ملا ہو۔ کس میں یہ جرأت تھی کہ ان کو نااہل قرار دے سکے، یا ان پر smart نہ ہونے کا فیصلہ صادر کر سکے، یا ان کو یہ حکم دے سکے کہ پہلے داڑھی منڈواؤ، پھر تمہیں فلاں منصب پر ترقی مل سکے گی۔ آج ہمارے کالے صاحب لوگوں میں سے نہ معلوم کتنے ایسے ہونگے جنہوں نے انگریزی دور میں کسی نہ کسی سکھ افسر کی ماتحتی کی ہوگی اور کبھی ان کو اس بات پر شرم نہ آئی کہ وہ ایک ڈاڑھی والے کی ماتحتی کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی شخص کبھی یہ ہمت نہ کر سکا کہ سکھوں کی داڑھی کا مذاق اڑانا تو درکنار، اس پر اعتراض تک کر سکے۔ یہ سب کچھ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت تھا کہ سکھ مسلمانوں سے زیادہ کیریکٹر رکھتے ہیں، ان سے زیادہ اپنے شعائر کا احترام کرتے ہیں، ان سے زیادہ اپنے پیشوائے دین کی اطاعت کرتے ہیں، اور ان سے کم ذہنی غلامی میں مبتلا ہوئے ہیں۔ کیا اس صریح علامتِ کم تری پر مسلمانوں کو

مطبوعات

مقالاتِ احسانی } تالیف۔ مولانا سید مناظر احسنؒ گیلانی
ناشر۔ ادارہ مجلسِ علمی کراچی

صفحات۔ ۴۹۶۔ قیمت۔ چھ روپے آٹھ آنے

مولانا سید مناظر احسنؒ گیلانی کی شخصیت پاک وہند میں کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ اُن کی کسی رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے مگر اُن کے تبحر علمی، اُن کے پاکیزہ احساسات، اور اُن کی دین سے محبّت اور شیفتگی کے بارے میں کسی اختلاف کی گنجائش نہیں۔ اُن کی پوری زندگی دینِ حق کی خدمت میں صرف ہوئی۔ زیر تبصرہ کتاب مولانا مرحوم کے تصوّف واحسان کے موضوع پر چند نہایت ہی بیش قیمت اور روح پرور مقالات کا مجموعہ ہے۔ پہلے مقالہ میں مولانا نے مختصراً طریقۂ غزالیہ اور طریقۂ اشغال مطلقہ کا موازنہ کیا ہے۔ دوسرے مقالہ میں طریقۂ غزالیہ پر بڑی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ تصوّف کے باب میں اس موضوع پر اس سے زیادہ وقیع مقالہ کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ ہمارے نزدیک اس کتاب کی جان مقالہ نمبر ۳ ہے جس میں مولانا نے اس حقیقت کی تصریح فرمائی ہے کہ حصول احسان کی صرف وہی راہ نہیں جو فنِ تصوّف کی متداول کتابوں میں اصحابِ سلاسل کی نسبت سے مذکور ہے بلکہ حق کا تلاش کرنے والا اپنے آپ کو تصوّف کے کسی سلسلہ نسبت سے وابستہ کیے بغیر محض شرعی احکام کی پابندی سے احسان کی راہ پا سکتا ہے۔ مولانا کی یہ بات بالکل صحیح اور شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہے۔

ادارہ مجلس علمی کراچی نے اس کتاب کو اپنے روایتی معیارِ طباعت پر شائع کرکے تصوّف کے ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔

الادب المفرد } تالیف عربی حضرت امام بخاری
ترجمہ۔ مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی (مظاہری)

ناشر۔ دارالاشاعت۔ بندر روڈ۔ کراچی نمبر ۱

قیمت۔ بارہ روپے۔

یہ مقدّس کتاب الادب المفرد حضرت امام بخاری کی اپنی روایت کردہ احادیث و آثار کا وہ مجموعہ ہے جس میں حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی اسلامی تہذیب و معاشرت اور اخلاق و معاملات کے معاملے میں تعلیمات درج ہیں۔ جو شخص بھی حضور سرورِ کائنات اور آپ کے جاں نثار صحابہ کے روزمرہ کے معمولات، اُن کے خاندانی تعلقات، انسانی حقوق کے بارے میں اُن کی فرض شناسی معاشرتی اور قومی ذمہ واریوں کے متعلق اُن کا نازک احساس معلوم کرنا چاہتا ہے وہ اس ایک کتاب کے مطالعہ سے انہیں پوری طرح جان سکتا ہے۔ سیرت و کردار کی تعمیر میں یہ کتاب ہمارے نزدیک سب سے زیادہ مفید اور کارآمد ہے۔

اس قابلِ قدر کتاب کی روایات کے متعلق مفتی محمد شفیع صاحب نے حافظ ابنِ حجرؒ کے حوالے سے فرمایا ہے کہ نصف درجۂ صحت کے اعتبار سے صحیح بخاری کے برابر ہیں۔ اور باقی نصف قوت و صحت کے اعتبار سے صحیح مسلم کے برابر ہیں اور باقی صحاح ستہ سے قوی تر ہیں۔

علامہ مفتی محمد شفیع صاحب کے فاضلانہ مقدمہ کے علاوہ مولانا خیر محمد صاحب نے کتاب کے آغاز میں علم اصول حدیث کی بعض اصطلاحات کی مختصر مگر نہایت جامع تشریح کی ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت میں اضافہ ہوا ہے۔

اس کتاب کو مولانا خلیل الرحمٰن نعمانی نے نہایت اچھے انداز میں اُردو میں منتقل کیا ہے۔ اور مطالعہ کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس فرض کو انھوں نے اُسی محبت سے سرانجام دیا ہے جس کا یہ مستحق ہے۔

ہم تمام مسلمانوں سے اس بیش قیمت کتاب کے مطالعہ کی پُرزور سفارش کرتے ہیں۔

آئینۂ تثلیث — تالیف۔ مولانا کوثر نیازی
ناشر۔ مکتبہ شہاب۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

صفحات ، ۲۵ - قیمت - ایک روپیہ -

مغربی استعمار نے گذشتہ دو صدیوں سے عیسائیت کو اپنے استعماری عزائم کا آلۂ کار بنا رکھا ہے۔ وہ جس ملک پر بھی یلغار کرنا چاہتا ہے۔ وہاں لشکر بھیجنے سے پہلے مکتی فوج کو ہراول دستے کی حیثیت سے بھیجتا ہے تاکہ وہ لوگوں کے دین وایمان پر ڈاکہ ڈال کر انہیں اخلاقی لحاظ سے کمزور بنا دے۔ یورپین استعمار کی یوں تو یہ ایک عام پالیسی ہے لیکن اسے اُمتِ مسلمہ کے معاملے میں بہت مفید پایا گیا ہے اُسے اس حقیقت کا پوری طرح علم ہو گیا ہے کہ مُسلم قوم کی قوت وطاقت کا اصل سرچشمہ صرف اسلام ہی ہے، اور اگر اسلام کی محبت مسلمانوں کے دلوں سے نکال دی جائے، تو پھر انہیں بڑی آسانی کے ساتھ مفتوح ومغلوب کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر دُنیائے مغرب نے مسلم ممالک میں عیسائیت کا جال پھیلانے میں سر توڑ کوششیں کی ہیں۔ عیسائی مشنریوں نے سیاسی غلبہ سے پہلے مُسلم ممالک کے اندر گھُس کر لوگوں کے دل ودماغ میں اسلام کے بارے میں مختلف شکوک وشبہات پیدا کر کے ان کی قوت کو توڑا۔ اور اس طرح استعمار کے لیے زمین ہموار کی۔ پھر جب تک اس کا سیاسی غلبہ قائم رہا۔ عیسائیت نے اس کے حفظ وبقا کے لیے ہر ممکن کوشش کی۔ اس نے سکولوں، کالجوں اور ہسپتالوں کے لیے ذریعہ استعمار کے لیے وہ خدمات سرانجام دیں جو کبھی اُس کی فوج اور مختلف انتظامی شعبے بھی نہ دے سکے۔ اور سیاسی غلبہ کے بعد جب اُسے ممالک کو چھوڑنا پڑا، تو یہ مشنری ادارے استعمار کے ناپاک عزائم کی برابر تکمیل کرتے رہے۔

پاکستان میں آج عیسائیت کے نام پر جو کاروبار ہو رہا ہے وہ اس حقیقت کی کھُلی شہادت ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد مکتی فوج نے اپنی سرگرمیاں تیز تر کر دی ہیں اور ہماری رواداری سے جس کے ڈانڈے بے حمیتی سے ملتے ہیں، ناجائز فائدہ اُٹھا کر مسلمانوں کو مُرتد بنایا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں جو حقائق سامنے آئے ہیں وہ بڑے ہی دلفگار اور عبرتناک ہیں۔ انہیں پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ مُسلم قوم کو اگر اسی ذلت اور خواری کے ساتھ جینا ہے تو پھر اسے زمین کے سینہ پر جینے کی بجائے اسے موت کی آغوش میں پناہ لینی چاہئے۔

مسیحیت کی جو مسخ شدہ صورت اس وقت ہمارے سامنے ہے اُس میں مسلمان کشش کا کوئی پہلو نہیں پا سکتا۔ توحید اور رسالت جیسے سادہ اور دل ودماغ کو اپیل کرنے والے عقائد کو چھوڑ کر وہ تثلیث کے

گورکھ دھندوں میں کیونکر اُلجھ سکتا ہے۔ وہ اگر عیسائیت کی طرف بڑھتا ہے تو اس کے صرف دو وجوہ ہیں۔ ایک روشن خیالی کا جنون اور دوسرے غربت اور افلاس۔ شہروں کے کھاتے پیتے گھرانوں کے بچوں کو تہذیب اور اعلیٰ تعلیم کی کشش عیسائی مدرسوں کی طرف کھینچ لیتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ چند سالوں کے اندر اپنے دین، اپنی روایات سے یکسر بیگانہ ہو جاتے ہیں اور وہ خواہ کھلے بندوں عیسائیت پر ایمان نہ لائیں لیکن اُس تہذیب کے پرستار ضرور بن جاتے ہیں جس کے اندر کسی مذہب کے ماننے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔ اور اگر کوئی مذہب قابلِ قبول ہو سکتا ہے تو وہ صرف عیسائیت ہی ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جو لوگ اس تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں وہ اگر مسلمان بھی ہیں تو اُن کا اسلام کا تصور بھی بڑا عجیب و غریب ہے۔ وہ اس دین کو صرف خالق و مخلوق کے درمیان ایک پرائیویٹ رشتہ سمجھ بیٹھے ہیں۔ جس کا انسان کی اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق اور سروکار نہیں ہوتا۔

دیہاتوں میں جو لوگ عیسائیت کی آغوش میں جا رہے ہیں وہ انتہائی مفلس اور قلاش ہیں۔ انہیں دودھ کے ڈبے، علاج معالجہ اور تعلیم کی سہولتیں مفتوح کرتی ہیں۔ اور بسا اوقات یہ بیچارے ظالم طبقوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اپنے دین کو خیر باد کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سفید فام پادری انہیں دنیاوی آفتوں سے بچا سکتا ہے۔

ہماری رائے میں عیسائیت کا راستہ روکنے کے لیے ہمیں مختلف محاذوں پر بیک وقت کام کرنا چاہیے۔ سب سے پہلے تو اس کے خطرات سے پوری قوم کو آگاہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ابھی تک عیسائی مشنریوں کی "ان معصومانہ سرگرمیوں" کے بارے میں ہمارے ذہن صاف نہیں ہوئے۔ پھر اس امر کی ضرورت ہے کہ علمی اعتبار سے عیسائیت کی خامیاں لوگوں پر واضح کی جائیں۔

مقامِ شکر ہے کہ ہمارے ہاں اس سلسلہ میں کچھ اضطراب پیدا ہوا ہے۔ خصوصاً دینی حلقوں کی طرف سے علیسائیت کو بے نقاب کرنے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ چنانچہ پچھلے ایک سال میں اس موضوع پر بعض مفید کتب بھی شائع کی گئی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب "آئینہ تثلیث" اس سلسلہ کی ایک ایک اہم کڑی ہے۔ اس میں فاضل مصنف نے عیسائیوں کی ریشہ دوانیوں پر بحث کرنے کے علاوہ

اُن کے عقائد اور طریق کار پر بھی بڑی سنجیدگی سے قلم اٹھایا ہے۔ اور اس طرح وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔

کتاب کا معیارِ کتابت اور طباعت نہایت عمدہ ہے اور قیمت نہایت کم۔ دینی ذوق رکھنے والے اصحاب کو چاہیئے کہ وہ اس کا خود بھی مطالعہ کریں اور اسے زیادہ سے زیادہ پھیلائیں۔

ختمِ نبوّت کے بارے میں

ایک ضروری اعلان

محترم مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی اس خواہش کے پیشِ نظر کہ مذکورہ بالا کتاب کی قیمت انتہائی کم رکھی جائے ہم نے اصل لاگت سے بھی کم قیمت پر پہلا ایڈیشن شائع کیا۔ بحمداللہ پہلا ایڈیشن جو پچیس ہزار کی تعداد میں طبع ہوا تھا ایک ہفتہ کے اندر اندر ختم ہو گیا۔

دوسرے ایڈیشن کے موقع پر بازار سے وہ کاغذ اچانک غائب ہو گیا اور انتہائی گراں قیمت پر بھی دستیاب ہونا دشوار ہو گیا۔ چنانچہ مجبوراً ہم نے دوسرا ایڈیشن دوسرے قسم کے کاغذ پر جو گراں قیمت بھی ہے طبع کرایا ہے۔ اس طرح ناقابلِ برداشت خسارہ کے پیشِ نظر ہمیں مجبوراً قیمت میں اضافہ کرنا پڑا۔ اب اس کی قیمت حسبِ ذیل ہوگی:

قیمت سستا ایڈیشن	قیمت اعلیٰ ایڈیشن
پندرہ روپے سینکڑہ۔ فی عدد ۱۷ پیسے	اٹھارہ روپے سینکڑہ۔ فی عدد ۲۰ پیسے

امید ہے کہ احباب ہماری اس مجبوری کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس اضافے کو خندہ پیشانی سے قبول فرمائیں گے۔ چونکہ دوسرا ایڈیشن بھی خاتمے کے قریب ہے اس لیے فرمائش جلد روانہ فرمائیں۔

المعلن

اخلاق حسین سکرٹری اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳ اے شاہ عالم مارکیٹ لاہور

ہمارے مستقل خریداروں میں اپنا نام درج کرائیے!

(اور)

ہماری مطبوعات خصوصی رعائتی قیمت پر حاصل کیجئے

ہم نے اپنے خریداروں کے فائدے کیلئے طے کیا ہے کہ:۔

ایسے تمام حضرات کو جو ہمارے یہاں بحیثیت خریدار درج رجسٹر ہونگے اپنی مطبوعات عام قیمت سے

بیس٪ فیصدی رعایت دیکر

کم قیمت پر مہیا کریں گے۔ پیکنگ خرچ ومحصول ڈاک بذمہ خریدار ہوگا۔
رجسٹر میں اندراج کے واسطے آپ کو نہ کوئی فیس داخلہ دینا ہوگی نہ کوئی مزید چندہ اور نہ ہی آپ اپنی مرضی کے خلاف کوئی کتاب خریدنے کے پابند ہونگے

اپنی پسند اور اپنی مرضی سے کتاب منتخب کیجئے اور رعائتی قیمت پر خریدئیے

جوں ہی ہم کوئی کتاب طبع کریں گے ہم اپنے مستقل خریداروں کو اس سے تفصیلی طور پر مطلع کرینگے۔ شرائط حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ابتدائی درخواست خریداری کے ہمراہ پانچ روپے بطور پیشگی (ڈپازٹ) کمپنی میں جمع کرانا ہوں گے۔ جب بھی آپ خریداری ختم کرنا چاہیں گے۔ آپ کو یہ رقم واپس کردی جائے گی۔

۲۔ ہر کتاب بذریعہ وی۔پی بھیجی جائے گی۔ اگر کوئی طلب کردہ وی۔پی واپس ہوگئی تو ڈاک خرچ وغیرہ پیشگی میں سے وضع کرلیا جائیگا۔ آئندہ کتاب اسی صورت میں بھیجی جائیگی جبکہ ڈاک خرچ کے نقصان کی رقم وصول ہوجائیگی۔

۳۔ خریداری کیلئے کوئی مدت کا تعین نہیں ہے۔ آپ جب چاہیں اور جتنی قیمت کی چاہیں کتب خرید سکتے ہیں۔

۴۔ اگر آپ ہماری مطبوعات پچاس روپے کی یکمشت خریدیں گے تو محصول ڈاک بذمہ کمپنی ہوگا۔

۵۔ دوسرے اداروں کی مطبوعہ کتب بھی نسبتاً رعائتی قیمت پر ہم اپنے مستقل خریداروں کو مہیا کر دیں گے ان کے لیئے مزید شرائط یہ ہوں گی:۔

ا:۔ کوئی فحش یا خلاف اسلام کتاب مہیا نہیں کی جائے گی۔

ب:۔ ان کتابوں پر ہم ۶½ فیصد سے لیکر ۱۲½ فیصد تک کمیشن دے سکیں گے۔ کمیشن کی شرح کا فیصلہ ہماری صوابدید پر ہوگا۔

ج:۔ کمیاب اور بیرون پاکستان کی مطبوعہ کتابوں کی قیمت کا فیصلہ حالات کے مطابق ہوگا۔

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور